ماہنامہ
جہد حق

پاکستان کمیشن
برائے انسانی حقوق

HRCP

جلد نمبر 26.....شمارہ نمبر 5.....جون 2019

(قیمت 10 روپے)

Monthly JUHD-E-HAQ - May-2019 - Registered No. CPL-13

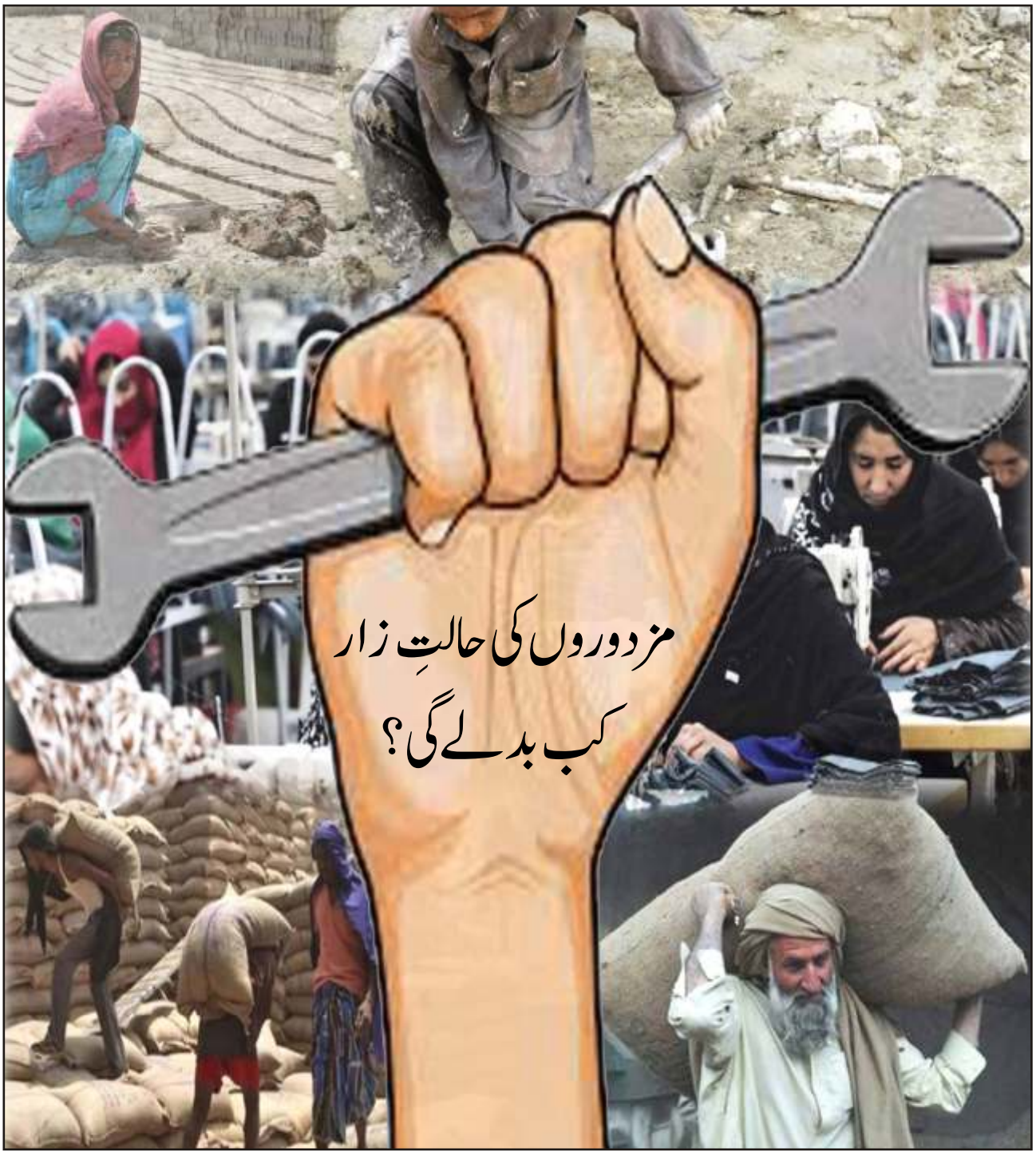

انسانی حقوق کے عالمی دن

مئی

3 مئی	آزادی صحافت کا عالمی دن
8-9 مئی	دوسری جنگ عظیم میں جاں بحق ہونے والے افراد کو یاد کرنے اور ان سے یکجہتی کا دن
10-11 مئی	نقل مکانی کرنے والے پرندوں کا عالمی دن (یو این ای پی)
13 مئی	''ویساک'' پورے چاند کا عالمی دن
15 مئی	کنبوں کا عالمی دن
17 مئی	ٹیلی مواصلات اور معلوماتی اداروں کا عالمی دن (آئی ٹی یو)
21 مئی	بحث مباحث اور ترقی کے لیے ثقافتی تنوع کا عالمی دن
22 مئی	حیاتیاتی تنوع کا عالمی دن
23 مئی	زچگی کے دوران پیدا ہونے والے گھاؤ کے خاتمے کا عالمی دن
29 مئی	اقوام متحدہ کے امن فوجی دستوں کا عالمی دن
31 مئی	تمباکو نوشی کی ممانعت کا عالمی دن

فہرست

پریس ریلیزیں	03
پاکستان: بلوستان کی صنعت میں مزدوروں کے حقوق کی پامالی	04
جدید غلامی کا مختصر جائزہ	08
شادی کی عمر کے معاملے پر بحث	14
انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے کے 70 سال	15
عورتیں	20
تعلیم	21

ظالم سماج میں بچوں کو تحفظ دیا جائے: ایچ آر سی پی

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کو یہ جان کر سخت صدمہ پہنچا ہے کہ دَس سالہ فرشتہ جو 15 مئی کو اسلام آباد میں اپنے گھر سے لاپتہ ہوئی تھی، کی آج نعش ملی ہے جسے مبینہ طور پر ریپ کا نشانہ بنا کر قتل کر دیا گیا۔ حالیہ واقعے اور قصور کی سات سالہ زینب کے واقعے میں ڈرا دینے والی مماثلت ہے جو معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے رحمی کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں بچوں کا جب چاہے استحصال اور قتل کر دیا جاتا ہے۔

'رواں ماہ میں اس طرح کے کم از کم سات واقعات سامنے آ چکے ہیں اور دو برس کی عمر کے بچوں کے ساتھ ریپ کی اطلاعات بھی سامنے آئی ہیں۔ بعض کو اپنے گھر واپس جانے کے لیے چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی صدمے کی حالت میں بسر کریں جس سے وہ دوچار ہوئے۔ دیگر کو مار کر ان کی نعشیں پھینک دی گئیں اور والدین کو زندگی بھر کے لیے اس کرب کو یاد کرنے اور محسوس کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ ساحل نامی این جی او کی رپورٹ کے مطابق 2018 میں 3,800 سے زائد بچوں کو کسی نہ کسی قسم کی بدسلوکی کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ تعداد 2017 میں پیش آنے والے ایسے واقعات سے 11 فیصد زیادہ ہے۔

اِس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ٹھوس اور مستعد طرائق کار اپنائے جائیں تاکہ چھوٹے بچوں، خاص طور پر چھوٹی بچیوں جو ہمارے معاشرے کا سب سے غیر محفوظ طبقہ ہیں، کا تحفظ یقینی بن سکے۔ پولیس اسٹیشنوں، ہسپتالوں جہاں ایسے واقعات کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے، عدالتوں اور مجموعی طور پر پورے معاشرے کو بچوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ رکھنا ہوگا اور انہیں چاہیے کہ اس طرح کے واقعات میں بچوں اور ان کے اہل خانہ کی مدد کے لیے بخوشی آگے بڑھیں۔ کوئی بھی معاشرہ بچوں کے ساتھ اس حد تک بے رحمی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔'

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 21 مئی 2019]

وزیرستان کے واقعے کی تحقیقات کے لیے پارلیمانی کمیشن قائم کیا جائے: ایچ آر سی پی

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کو وزیرستان میں فوجی طاقت کے استعمال جس کے نتیجے میں پی ٹی ایم کے کم از کم تین کارکن ہلاک ہوئے ہیں، پر تشویش ہے۔ ایچ آر سی پی کے خیال میں یہ واقعہ پی ٹی ایم کے حامیوں اور سیکیورٹی اداروں کے درمیان پہلے سے موجود تناؤ میں اور زیادہ شدت پیدا کرے گا اور قبائلی اضلاع کے عوام اور ریاست کے مابین مستقل خلیج کا سبب بنے گا۔ ایچ آر سی پی کا مطالبہ ہے کہ ایم این اے علی وزیر اور زیرِ حراست دیگر کارکنوں کو رہا کیا جائے۔ اس کے علاوہ، معاملے کی تحقیقات اور حقائق کا پتہ چلانے کے لیے فوری طور پر پارلیمانی کمیشن قائم کیا جائے۔ مقامی لوگوں کی تکالیف جنہیں پی ٹی ایم ایک برس سے زائد عرصہ سے پرامن طریقے سے اجاگر کر رہی ہے، کو دور کرنے کے لیے سنجیدہ کوشش کی ضرورت ہے۔ مزید برآں، آئین میں چھبیسویں ترمیم کے ساتھ، ریاست ذرائع ابلاغ اور سول سوسائٹی کو سابق فاٹا تک رسائی دے۔ ملک کے مرکزی ذرائع ابلاغ بھی اس چیز کا احساس کریں کہ اس علاقے کے بارے میں اطلاعات دیتے وقت ان پر دیانتداری کا مظاہرہ کرنے کی ذمہ داری عائد ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 27 مئی 2019]

پی سی ایس ڈبلیو کی چیئرپرسن کو بحال کیا جائے

حکومتِ پنجاب نے پنجاب کمیشن برائے حقوقِ نسواں (پی سی ایس ڈبلیو) کی چیئرپرسن فوزیہ وقار کو قواعد و ضوابط کے برخلاف ایک دم سے برطرف کر دیا ہے جس پر پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کو شدید تشویش ہے۔

ایچ آر سی پی نے نوٹیفکیشن کی فوری واپسی اور محترمہ وقار کی بحالی کا مطالبہ کیا ہے۔ ان کا شمار عورتوں کے حقوق کے پُرعزم دفاع کاروں میں ہوتا ہے اور ان کی کارکردگی ہمیشہ سے لائقِ تحسین رہی ہے۔ انسانی حقوق کے اداروں کے کام کا دائرہ کار پہلے ہی بہت محدود ہے لہٰذا اُنہیں سیاسی مصلحت کی نذر نہ کیا جائے۔ بلکہ اگر ان کو بامعنی بنانا مقصود ہے تو پھر اُنہیں آزادی کے ساتھ کرنے دیا جائے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 25 مئی 2019]

پاکستان: ملبوسات کی صنعت میں مزدوروں کے حقوق کی پامالی

شبانہ (فرضی نام) جو کہ 8 سال سے زائد عرصہ سے لاہور کی ایک ملبوسات کی فیکٹری میں دیگر 500 مزدوروں کے ساتھ کام کر رہی ہیں، ان کا کہنا ہے کہ کام کرنے کی شرائط بہت سخت ہیں اور ہمیشہ ملازمت سے نکالے جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

کوئی تحریری معاہدہ موجود نہیں اور ملازمت کا ثبوت صرف ایک کارڈ ہے۔ کارخانے کی انتظامیہ خود مزدوروں کی حاضری لگاتی ہے اور 9 گھنٹے کے بعد انہیں باہر جانا ظاہر کرتی ہے تاکہ اگر کوئی ریکارڈ کا معائنہ کرے تو یہ ظاہر ہو کہ انتظامیہ قانون کی پاسداری کر رہی ہے۔ درحقیقت ہم زیادہ گھنٹوں کے لیے کام کرتے ہیں اور بیماری کی چھٹی بھی نہیں دی جاتی۔ لیکن اگر کوئی ایک دن کے لیے بھی بیمار پڑ جائے تو اس کی تنخواہ سے کٹوتی کی جاتی ہے اور زچگی کے لیے بھی کوئی رخصت نہیں دی جاتی۔ کوئی خاتون حاملہ نظر آئے تو اسے ملازمت چھوڑنے کا کہا جاتا ہے۔

پاکستان کی ملبوسات کی صنعت میں شبانہ جیسی لاکھوں مزدور ہیں جو استحصال اور قوانین کے غلط استعمال کا شکار ہیں۔ حالیہ سالوں میں غیر مرئی کارکنان قومی مذاکرات میں فریق نظر نہیں آتے المناک بات یہ ہے کہ اس کی وجوہات عام طور پر غلط اور افسوسناک ہیں۔

مثال کے طور پر مئی 2017 میں کھاڈی جو کہ پاکستان میں ملبوسات بنانے والوں کا ایک نمایاں برانڈ ہے۔ کے کارکنان نے ملک بھر میں احتجاج کیا جس سے پاکستان میں پارچات کے شعبہ میں وسیع اور سنگین مسائل منظر عام پر آئے یہ احتجاج تب شروع ہوئے جب کھاڈی میں 32 مزدوروں کو ملازمت سے اس لیے برطرف کر دیا گیا کہ وہ پاکستانی قانون کے مطابق اپنے حقوق کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مزدوروں کی شکایات میں درجنوں مزدوروں کو بلا وجہ برخاست کرنا، حفظان صحت کے منافی کام کرنے کے حالات، بہت زیادہ طویل اوقات کار اور کم از کم مقرر کردہ اجرت سے کم تنخواہ شامل ہیں۔ ایک ماہ کے بعد کھاڈی کے یونین رہنماؤں کے ساتھ سمجھوتے کے نتیجے میں کچھ مزدوروں نے اپنی شکایات واپس لے لیں اگرچہ ایک سال بعد بھی مزدوروں کے ایک سرگرم کارکن کے مطابق ابھی بھی مزدوروں کی بہت سی شکایات کا ازالہ نہیں کیا گیا۔

پانچ سال قبل 12 ستمبر 2012 کو کراچی میں علی انٹر پرائزز گارمنٹس فیکٹری میں آگ لگنے سے پاکستان کی تاریخ کا سب سے ہولناک صنعتی سانحہ وقوع پذیر ہوا جس میں 255 مزدور ہلاک اور 100 سے زیادہ زخمی ہوئے تفتیش کے نتیجہ میں بہت سی بے ضابطگیاں پائی گئیں۔ جن میں حفاظتی نظام اور آگ بجھانے کا طریقہ کار بالکل موجود نہ تھا۔ زندہ بچ

کوئی تحریری معاہدہ موجود نہیں اور ملازمت کا ثبوت صرف ایک کارڈ ہے۔ کارخانے کی انتظامیہ خود مزدوروں کی حاضری لگاتی ہے اور 9 گھنٹے کے بعد انہیں باہر جانا ظاہر کرتی ہے تاکہ اگر کوئی ریکارڈ کا معائنہ کرے تو یہ ظاہر ہو کہ انتظامیہ قانون کی پاسداری کر رہی ہے۔ درحقیقت ہم زیادہ گھنٹوں کے لیے کام کرتے ہیں اور بیماری کی چھٹی بھی نہیں دی جاتی۔ لیکن اگر کوئی ایک دن کے لیے بھی بیمار پڑ جائے تو اس کی تنخواہ سے کٹوتی کی جاتی ہے اور زچگی کے لیے بھی کوئی رخصت نہیں دی جاتی۔ کوئی خاتون حاملہ نظر آئے تو اسے ملازمت چھوڑنے کا کہا جاتا ہے۔

جانے والے مزدوروں کے مطابق انتظامیہ نے فوری طور پر مزدوروں کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کی تھی اور اس کے بجائے انہوں نے پہلے اپنا مال بچانے کی کوشش کی۔

علی انٹر پرائزز جو کہ بنیادی طور پر ایک جرمن برانڈ کو مال سپلائی کرتی ہے میں لگنے والی مہلک آگ نے بھی سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے طریقہ کار اور جانچ پڑتال کے الزام میں سنگین نقائص کو بے نقاب کیا۔ اٹلی کی ایک معائنہ کمپنی رینا سروسز نے آگ لگنے کے واقعہ سے صرف 22 دن قبل اس فیکٹری کو سرٹیفکیٹ جاری کیا تھا کہ فیکٹری میں حفاظت کے نظام اور آگ سے بچاؤ کے ضروری انتظامات موجود ہیں۔ اور لیبر قوانین کی پابندی کی جا رہی ہے۔ جانچ پڑتال کی کمپنی رینا نے ملک میں واقعہ سو سے زائد کارخانوں کو اسی قسم کے سرٹیفکیٹ جاری کیے تھے۔

141 لوگوں جن میں 25 ملبوسات کے کارخانوں کے 118 مزدور بھی شامل تھے کے انٹرویوز کی بنیاد پر تیار کی گئی اس رپورٹ میں یونین کے رہنماؤں، حکومتی نمائندوں اور مزدوروں کے حقوق کی وکالت کرنے والوں کی رائے بھی شامل ہے۔ رپورٹ کے مطابق پاکستانی حکومت مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کرنے میں بری طرح ناکام ہوئی ہے اور کھاڈی کے مزدوروں کے احتجاج اور علی انٹر پرائزز میں لگنے والی آگ سے جو سبق حکومت کو سیکھنا چاہیے تھا اس پر عمل نہ کیا گیا، اس کے نتیجہ میں پاکستان میں ملبوسات کے کارخانوں کے مزدور بدوستور بدسلوکی کا شکار ہیں اور ان کی شکایات کا ازالہ نہیں کیا گیا۔

پاکستان میں ملبوسات تیار کرنیوالی وسیع صنعت کے مد نظر تحقیق کا دائرہ محدود ہے تاہم یہ بڑے پیمانے پر مزدوروں کے کام کرنے کے برے حالات کی نشاندہی کرتی ہے اور اس سلسلے میں مزدوروں کی شکایات اور ان کے حقوق کی وکالت کرنے والوں، معائنہ کے نظام کی ناکامی کی تفصیل بیان کرتی ہے کہ کیسے مزدوروں سے متعلق قوانین اور ضابطوں کی تعمیل نہیں کی جاتی۔

ہم نے اس تحقیق میں خاص طور پر ملوسات کے بین الاقوامی برانڈز کو محور نہیں بنایا۔ لیکن 20 فیصد پاکستانی کار خانے بین الاقوامی منڈی کے لیے سلے سلائے ملبوسات تیار کرتے ہیں ان کمپنیوں کی ذمہ داری ہے کہ ہر مال کی سپلائی کرنے تک مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کو یقینی بنائے۔

کچھ اندازوں کے مطابق پاکستان کی ملبوسات کی صنعت میں ڈیڑھ کروڑ لوگ کام کرتے ہیں۔ جن میں 38 فیصد ملبوسات کو تیار کرنے والے مزدور ہیں۔ مجموعی طور پر ملازمت کا تحفظ نہ ہونا ان کی ملازمت سے برخاست کرنے اور مزدوروں کو قابو میں رکھنا آسان بناتا ہے۔ حکومت کی طرف سے معائنہ کے برے نظام اور آزاد مزدور یونین کے خلاف جارحانہ اقدامات کی وجہ سے مزدوروں کے لیے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا مشکل بنا دیا ہے۔

اگرچہ زیادہ کارخانے ملکی منڈیوں کے لیے مال تیار کرتے ہیں، کچھ ریاست ہائے متحدہ اور یورپ کی مشہور کمپنیوں کے لیے مال تیار کرتے ہیں۔ بڑے کارخانے صنعت کے منظم شعبے کا حصہ ہیں اور بین الاقوامی برانڈ کے ملبوسات تیار کرتے ہیں۔ مال کی زیادہ تر تیاری غیر رسمی معیشت کے طور پر چھوٹی غیر رجسٹرڈ دکانات اور بغیر نام کی

عمارات میں کی جاتی ہے۔ چھوٹے کارخانے ملکی برانڈ رجسٹرڈ اور غیر رجسٹرڈ دونوں کے لیے مال تیار کرتے ہیں۔

چھوٹے کارخانوں میں کام کرنے کے حالات بڑے کارخانوں کی نسبت زیادہ برے ہوتے ہیں کیونکہ بڑے کارخانے جو بین الاقوامی برانڈ کے لیے مال تیار کرتے ہیں ان کے معائنہ کیے جانے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں، چھوٹے کارخانوں کے مالکان مزدوروں کی مقرر کردہ کم از کم تنخواہ سے بھی کم اجرت ادا کرتے ہیں اور ملازمت کے لیے معاہدہ کم مدت کے لیے کرتے ہیں۔ جو کہ زبانی ہوتا ہے۔ پاکستان کے بڑے کارخانوں میں بھی مزدوروں کے حقوق کی خلاف ورزیاں ہوتی ہیں بشمول مقررہ اوقات کار سے زائد کام کروانا چھٹی نہ دینا اور کم معیاد کے معاہدے کرنا جو تحریر نہ کئے گئے ہوں۔

مزدوروں کے حقوق کی خلاف ورزیاں

ملبوسات کے کارخانوں میں مزدوروں کے لیے کام کرنے کے برے حالات کا احتساب نہ کرنا صنعتی تنازعات کی اصل وجہ ہے، مزدوروں کے حقوق کی خلاف ورزیاں تمام کارخانوں میں ہوتی ہیں جن میں ملکی قانون پر عمل نہ کرنا اور ضابطہ اخلاق کی پیروی نہ کرنا شامل ہیں۔ ان کے لیے مغربی ممالک کے ملبوسات فروخت کرنے والے مطالبات کرتے ہیں کہ مال کی تیاری کے معاہدے اور مال فراہم کرنے والے ان قوانین کی پابندی کریں۔ مزدور جن میں کئی خواتین شامل ہیں نے ہیومن رائٹس واچ کو بتایا کہ ان کے ساتھ زبانی اور جسمانی بدسلوکی کی گئی ہے۔ کئی دفعہ اس کی نوعیت جنسی بھی ہوتی ہے۔ کئی مرتبہ جبری طور پر زائد وقت کے لیے کام کروانا۔ زچگی کے دوران رخصت کی تنخواہ نہ دینا۔ بیماری کی چھٹی سے انکار اور مقرر کردہ کم از کم تنخواہ ادا کرنے میں ناکامی شامل ہے۔ مزدوروں نے یہ بھی کہا کہ ان کو اس بات پر دباؤ میں رکھا جاتا ہے کہ وہ باتھ روم جانے کے لیے وقفہ نہ لیں، کچھ نے شکایت کی کہ ان کو پینے کے لیے صاف پانی مہیا نہیں کیا جاتا کراچی کے ایک کارخانے کے مزدور نے کہا:

مجھے اس وقت ملازمت سے برخاست کر دیا گیا جب میں بیمار تھا اور مجھے تیز بخار تھا۔ جب میں واپس آیا تو مجھے اندر داخل نہ ہونے دیا گیا اور مجھے بتایا گیا کہ میری ملازمت ختم ہو چکی ہے جو کوئی بھی بیمار ہوتا ہے اسے ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے ایک خاتون مزدور جس کو معدہ میں زخم تھا نے آپریشن کے لیے کچھ دنوں کے لیے رخصت مانگی لیکن رخصت دینے کی بجائے اسے ملازمت سے نکال دیا گیا۔

ہیومن رائٹس واچ کو کراچی میں ایک مزدور خاتون نے بتایا:

زچگی کی رخصت نہیں دی جاتی ہے حاملہ خواتین ملازمت چھوڑ گئی ہیں (ملازمت سے برخاست کرنے کی بجائے چھوڑ گئی ہے استعمال کیا جاتا ہے) اور اب جب بھی کوئی خاتون حاملہ ہوتی ہے تو وہ ملازمت سے برخاست ہونے کی بے عزتی سے بچنے کے لیے خود ہی ملازمت چھوڑ دیتی ہے۔

کچھ چھوٹے کارخانے کئی دفعہ بچوں کو ملازم رکھتے ہیں، کئی دفعہ ان کی عمر 13 سال ہوتی ہے تا کہ انہیں کم از کم مقررہ تنخواہ ادا نہ کرنا پڑے اور نہ ہی زائد وقت کی اجرت ادا کرنا پڑے۔ ہیومن رائٹس واچ نے ملبوسات کے کارخانوں میں کام کرنے والے 9 بچوں سے بات کی گئی جو کہ تمام ملکی مارکیٹ کے لیے کام کر رہے تھے ان میں سے کسی بچے کے ساتھ تحریری معاہدہ نہ کیا گیا تھا، انتظامیہ اس بنیاد پر ان کے ساتھ ملازمت کا معاہدہ کرنے اور دیگر مراعات دینے سے گریز کر سکتی ہے کیونکہ 18 سال سے کم عمر ہونے کی وجہ سے ان کے پاس قومی شناختی کارڈ این آئی سی نہیں ہوتا اور اس کو حکومت کی جانب سے طے شدہ اجرت نہ دینے کا بہانہ بنایا جاتا ہے۔ بچے اکثر اپنے والدین خاص طور پر ماؤں کے ساتھ کارخانہ میں آتے ہیں اور وہ بغیر کسی رسمی معاہدہ کے کام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ 17 سالہ وہاب جو کہ کراچی کا رہنے والا ہے اور 14 سال کی عمر سے مزدوری کر رہا ہے نے کہا:

منتظمین ہمارے لیے ناشائستہ زبان استعمال کرتے ہیں اور اکثر بلاوجہ ہمیں کوئی معاہدہ ملازمت، سوشل سکیورٹی کارڈ اور بیماری کی بنا پر رخصت نہیں دی جاتی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ تمہیں رخصت اور زیادہ تنخواہ کا حق نہیں ہے کیونکہ تمہارے پاس شناختی کارڈ نہیں ہے۔

کارخانوں میں حکومت کی جانب سے دی گئی مراعات کا بھی غلط استعمال کیا جاتا ہے یکم دسمبر 2018 کو لاہور میں ملبوسات کے کارکنان کی تربیت کے ادارے جس کو ایک بڑا پاکستانی برانڈ چلاتا ہے میں احتجاج ہوا۔ مزدوروں کا کہنا تھا کہ کمپنی حکومت کی جانب سے تربیت کے ادارے قائم کرنے کی ترغیب کو غلط استعمال کر رہی ہے، حکومت ہر تربیت یافتہ مزدور کے لیے دو ہزار روپے مہیا کرتی ہے، مزدوروں نے الزام لگایا کہ درحقیقت انتظامیہ بغیر اجرت ادا کیے کارخانہ چلاتی ہے اس لیے مزدوروں نے کام بند کر دیا اور وہ منتظم کے دفتر کے باہر اکٹھے ہو گئے اور تنخواہ کا مطالبہ کیا تربیت کے ادارے میں ایک مزدور نے کہا: کمپنی اپنے کارخانہ کو ریکارڈ میں تربیت گاہ ظاہر کرتی ہے۔ لیکن یہاں کوئی تربیت نہیں دی جاتی۔ یہ ایک کارخانہ ہے، حکومتی معائنہ ٹیمیں بھی اس سازش میں شریک ہیں، جو لوگ زیر تربیت ظاہر کئے جاتے ہیں وہ اصل میں ملبوسات کے ماہر کاریگر ہوتے ہیں۔

گھروں میں رہ کر کام کرنے والے مزدور

پاکستان جیسے قدامت پسند معاشرے میں خواتین رسمی طور پر کام کرنے والی افرادی قوت کا حصہ نہیں بنتی لیکن وہ گھر میں رہتے ہوئے کام کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں۔ پاکستانی برانڈ کے لیے ملبوسات تیار کرنے والی بہت سی فیکٹریاں گھروں میں کام کرنے والی مزدور خواتین کو موسم یا آرڈر کے مطابق استعمال کرتی ہیں۔ اس قسم کی مزدور خواتین کے سرکاری طور پر اعداد و شمار موجود نہیں ہیں، 2014 میں انٹرنیشنل جرنل برائے سوشل ورک اینڈ ہیومن سروسز پریکٹس کے اندازے کے مطابق غیر رسمی معیشت کے لیے پاکستان میں کام کرنے والی 77 تا 83 فیصد مزدور خواتین گھروں میں کام کرتی ہیں۔

ہیومن رائٹس واچ نے لاہور اور کراچی میں موسم کی بنیاد پر گھروں میں ملبوسات کے کارخانوں کے لیے کام کرنے والی 23 خواتین سے بات کی۔ عالمی ادارہ برائے محنت کے مطابق گھروں میں کام کرنے والی خواتین مزدور بنیادی طور پر ملکی منڈی کے لیے کام کرتی ہیں۔ جن خواتین کا ہیومن رائٹس واچ نے انٹرویو کیا وہ اس کارخانے کا نام بھی نہیں جانتی تھیں جس کے لیے وہ کام کرتی تھیں اور نہ ہی وہ برانڈ جس کے لیے وہ کام کر رہی تھیں، دلال عام طور پر خواتین کو سلے ہوئے ملبوسات سے فالتو دھاگے کاٹنے کے لیے ملازم رکھتے ہیں اس کے علاوہ ان سے کڑھائی، کاج بنانے اور پلاسٹک کے تھیلوں میں ملبوسات کو پیک کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ ایک خاتون جو بیس سال سے گھریلو مزدور کے طور پر کام کر رہی ہے نے ہیومن رائٹس واچ کو بتایا:

ہمیں کام ٹھیکیدار مہیا کرتا ہے اور وہی ہمارا واحد رابطہ ہوتا ہے، فی جوڑا اجرت دو تا چار روپے ہوتی ہے کئی مرتبہ ٹھیکیدار مال کی تیاری سے قبل اجرت طے نہیں کرتا اور کہتا ہے: ''ایک دفعہ تم مال تیار کر لو تو ہم اجرت طے کر لیں گے۔'' ہم اس کے ساتھ کسی قسم کا بھاؤ نہیں کر سکتے اگر ہم ایسا کریں تو آئندہ وہ ہمیں آرڈر برائے تیاری مال نہیں دے گا۔

مزدور انجمن کو توڑنا

مزدوروں کے حقوق کے سرگرم کارکنوں کو شکایت ہے کہ اکثر بڑے کارخانے دار مزدور انجمن کو توڑ دیتے ہیں۔ کارخانے کے منتظمین اکثر مزدوروں کو مختصر عرصہ کے معاہدہ پر ملازمت پر رکھتے ہیں تا کہ مزدور یونین کی سرگرمیوں میں ان

کی شرکت کی حوصلہ شکنی ہو۔کئی سالوں کی ملازمت کے باوجود بھی ان کو ملازمت پر مستقل نہ کرنا، یونین کے عہدیداران کو ملازمت سے برخاست کرنا اور ہراساں کرنا تاکہ وہ آزاد یونین نہ بنا سکیں اور انتظامیہ کی حمایتی یونین کی حوصلہ افزائی کرنا شامل ہے۔

کارخانہ کے مالک لیبر قوانین کے لیے ساز باز کر کے مزدوروں کے لیے رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ ٹریڈ یونین رجسٹرڈ نہ کروا سکیں۔اس کے لیے بنیادی حربہ کے طور پر وہ جعلی یا زرد یونین جو کہ ایسے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو کہ فرضی ملازمین ہوتے ہیں جس سے اصل مزدوروں کے لیے یونین کو رجسٹرڈ کروانا ناممکن ہو جاتا ہے۔کیونکہ قانونی طور پر کارخانہ میں کل مزدوروں کی 5/1 تعداد کا یونین کا ممبر ہونا ضروری ہے۔

بہت کم مواقع پر کارخانہ کے مزدور کامیابی سے یونین سازی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ کارخانہ کے مالکان رشوت کا استعمال کرتے ہیں، دھمکیاں دیتے ہیں اور تشدد کے ذریعہ ڈرا دھمکا کر انہیں دباتے ہیں۔

مثال کے طور پر 6 جولائی 2010 نامعلوم مسلح افراد نے گولی مار کر ممتاز مزدور رہنما مستنصر رندھاوا اور اس کے بھائی کو پنجاب کے ضلع فیصل آباد میں ہلاک کر دیا۔رندھاوا مزدور قومی تحریک کا رہنما تھا۔مزدور قومی تحریک کپڑا ملوں اور پاور لومز کے شعبہ میں مزدوروں کو فیصل آباد کے صنعتی ضلع میں منظم کرنا چاہتی تھی۔اس کو معاوضہ بڑھانے کے لیے ہڑتال کرنے کا اعلان کرنے کے فوراً بعد ہلاک کر دیا گیا۔ مزدوروں نے اس کی ہلاکت اور معاوضہ بڑھانے کے لیے ہڑتال کی۔ پولیس نے احتجاج کرنے والوں کے خلاف طاقت استعمال کی جس سے کئی مضروب ہوئے اور 100 سے زائد گرفتار ہوئے۔ بعد میں مزدور قومی تحریک کے چھ لیڈر گرفتار کر لیے گئے۔جن کے خلاف دہشت گردی کی دفعات کے تحت مقدمات چلائے گئے کہ انہوں نے ہڑتال کے دوران فیکٹری میں آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ نومبر 2011 میں انسداد دہشت گردی کی عدالت نے ان 6 مزدور رہنما کو عمر قید کی سزا سنائی۔

مارچ 2012 میں مزدوروں کے حقوق کے 12 سرگرم کارکنوں پر کراچی میں انسداد دہشت گردی کی عدالت میں فرد جرم عائد کی گئی کہ وہ بھتہ وصول کرتے تھے، ان میں سے 6 کو گرفتار کیا گیا ان کو حراست کے دوران مار پیٹ کی گئی۔ مئی 2012 میں ان کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔آخر کار اگست 2014 میں عدالت نے مقدمہ چلانے کے بعد ان کو بری کر دیا، اس مقدمہ میں عدالت میں 100 سے زائد پیشیاں پڑیں۔دسمبر 2017 میں مزدوروں کے حقوق کے سرگرم کارکن نے ہیومن رائٹس واچ کو بتایا کہ انہیں سکیورٹی ایجنسیز کی جانب سے دھمکیاں دی گئی ہیں کیونکہ انہوں نے مزدوروں کے قوانین پر عمل درآمد کے بارے میں یا بدسلوکی کے بارے میں شکایات کی۔کئی یونین رہنماؤں کے مطابق کارخانہ مالکان اکثر مزدوروں کو رشوت دیتے ہیں کہ وہ اپنے

> ہم نے ہڑتال کو کامیابی سے منتظم کیا اور فیکٹری تقریباً بند ہوگئی تھی۔ ہم مطالبہ کر رہے تھے کہ ہمارے معاہدوں کو باضابطہ کیا جائے اور مزدوروں کو مستقل ملازمین بنایا جائے۔ مجھے انتظامیہ نے بات چیت کے لیے بلوایا۔ان کا اصرار تھا کہ میں اکیلا آؤں۔انہوں نے مجھے ایک کار اور تین لاکھ روپے کی پیشکش کی تاکہ میں مزدوروں کو ہڑتال ختم کرنے پر آمادہ کروں۔

مطالبات سے پیچھے ہٹ جائیں۔ایک یونین لیڈر نے ہیومن رائٹس واچ کو بتایا:

ہم نے ہڑتال کو کامیابی سے منتظم کیا اور فیکٹری تقریباً بند ہوگئی تھی۔ہم مطالبہ کر رہے تھے کہ ہمارے معاہدوں کو باضابطہ کیا جائے اور مزدوروں کو مستقل ملازمین بنایا جائے۔ مجھے انتظامیہ نے بات چیت کے لیے بلوایا۔ان کا اصرار تھا کہ میں اکیلا آؤں۔انہوں نے مجھے ایک کار اور تین لاکھ روپے کی پیشکش کی تاکہ میں مزدوروں کو ہڑتال ختم کرنے پر آمادہ کروں۔

ملبوسات کی بین الاقوامی کمپنیاں

حالانکہ پاکستان کی ملبوسات کی صنعت زیادہ تر ملکی منڈیوں کے لیے مال کی تیاری کرتی ہے، لیکن بہت سی فیکٹریاں مشہور بین الاقوامی برانڈز کے لیے بھی مال تیار کرتی ہیں اور یہ امریکہ، برطانیہ، یورپ اور چائنہ کو بھی برآمد کرتی ہیں۔

ان میں سے کچھ فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے استحصال والے حالات کار کی شکایات کرتے ہیں، مثال کے طور پر حافظ آباد ضلع میں بین الاقوامی برانڈ تیار کرنے والی ایک فیکٹری میں مزدوروں نے بتایا کہ آزاد یونین کے ساتھ تعلق رکھنے والے مزدوروں کو انتظامیہ ڈرانے، دھمکانے کی کوشش کرتی ہے۔

ہیومن رائٹس واچ کے ایک خط کے جواب میں فیکٹری انتظامیہ نے کہا کہ وہ مزدوروں کے یونین کے ساتھ شامل ہونے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور کبھی بھی انہوں نے مزدوروں کو ایسا کرنے سے روکنے کے لیے غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال نہیں کئے۔فیکٹری انتظامیہ کی جانب سے تین عدد یونین کی تفصیل بھی مہیا کی۔ جو کہ رجسٹرڈ ہیں۔لیکن مزدوروں نے اس دعویٰ کی تردید کی ہے اور کہا کہ فیکٹری انتظامیہ آزاد یونین کے رجسٹرڈ کرنے کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔اور یونین ممبرز کو دھمکایا کہ وہ اپنی مرضی سے ملازمت چھوڑ دیں۔

بین الاقوامی برانڈز کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مال مہیا کرنے کے دوران تمام سطحوں پر مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کو فروغ دیں چاہے وہ براہ راست مہیا کردہ مال ہو یا ٹھیکیدار کے ذریعے بالواسطہ اگرچہ بہت سے برانڈز اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان کو مال کی سپلائی کے دوران ضابطہ اخلاق کی پابندی کی جائے لیکن پھر بھی اس کے عمل درآمد میں مختلف مرحلوں پر خلا پائے جاتے ہیں جس کی وجہ مال مہیا کرنے کے عمل میں شفافیت کی کمی اور ملبوسات کی خریداری کے عمل کے دوران مناسب محنت کی ضرورت ہے۔اور مزدوروں تک مضبوط رسائی کے ذریعہ ان کے مسائل کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔

احتساب کو یقینی بنانا

بین الاقوامی انسانی حقوق اور لیبر لاز پاکستانی حکومت پر یہ ذمہ داری عائد کرتے ہیں کہ وہ مزدوروں کے حقوق کی پاسداری کو یقینی بنائے اور جب بھی ان کے ساتھ زیادتی ہو ان کو اس کے ازالہ کے لیے رسائی حاصل ہو۔محکمہ محنت جو کہ چاروں صوبوں میں موجود ہے کو کہا جائے کہ وہ موثر قوانین کے ساتھ مزدوروں کے کام کرنے کے حالات کا معائنہ کرے اور ان کو قوانین لاگو کرنے کے لیے اختیارات حاصل ہوں۔لیکن تاحال پاکستان میں محکمہ محنت کا معائنہ نظام بالکل غیر موثر ہے اور رشوت کے الزامات کا باعث ہے۔

2017 میں ایک تخمینے کے مطابق ملک میں تین لاکھ پچاس ہزار سے زائد کارخانوں کے لیے 547 لیبر انسپکٹرز تھے۔ان میں صرف 17 خواتین تھیں۔ جو کہ ایک بہت بڑی زیادتی ہے کیونکہ ملبوسات کے شعبہ میں کام کرنے والے مزدوروں کا 30 فیصد خواتین ہیں۔ یہ جیو کے میڈیا ہاؤس کے ایک اندازے کے مطابق ہے۔ان خواتین کو ملازمت کے ہر مرحلہ بشمول ملازمت دینے، ترقی اور ملازمت سے برخاست کرنے پر امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کارخانے والے خواتین کے لیے مناسب کام کرنے کے حالات مہیا نہیں کرتے خاص طور پر حاملہ خواتین کے لیے زیادہ خواتین کو

کم تنخواہ پر اور کم مہارت کے کاموں پر معاہدہ کے تحت ملازم پر رکھا جاتا ہے۔ مزدور یونین کے ایک رہنما نے کہا:

کراچی میں پورے شہر کے لیے صرف 2 لیبر انسپکٹرز ہیں (کراچی میں ملک کی 70 فیصد صنعت واقع ہے) جب کہ ملک میں کل 200 تا 225 لیبر انسپکٹرز ہیں، خواتین مزدور جنسی تشدد کے بارے میں بات کرنے میں انتہائی کشمکش و پیچ کا شکار ہوتی ہیں اور اپنے دیگر ذاتی مسائل بھی مرد حکومتی اہلکاروں کے ساتھ بیان کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہوتی ہیں۔

مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کی بنیادی ذمہ داری حکومت پاکستان پر ہے۔ پاکستانی قوانین بین الاقوامی معیار بشمول آئی ایل او کنونشن پر پورے نہیں اترتے۔ موجودہ ملکی قوانین کے سختی سے نافذ کرنے سے بھی مزدوروں کے حقوق کی حفاظت میں بڑی پیش قدمی ہو سکتی ہے۔ انسپکٹرز اور دوسرے حکام پر زیادہ بوجھ ہے یا پھر وہ ساز باز میں شریک ہو کر زیادتیوں کے عمل کو جاری رہنے دیتے ہیں۔

فیکٹری مالکان کو بھی اصلاح کے لیے عزم رکھنا چاہیے۔ حکومت آل پاکستان ٹیکسٹائل ملز ایسوسی ایشن اور پاکستان سلے سلائے ملبوسات تیار کرنے والے اور برآمد کرنے والے مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کرنے والے ضابطوں کو نافذ کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اور اسی طرح ان کمپنیوں کے خلاف انضباطی کارروائی کے لیے بھی جو مزدوروں کے حقوق کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ تاہم پاکستان میں بہت سے فیکٹری مالکان سیاسی اثر و رسوخ رکھتے ہیں جس وجہ سے فیکٹریوں میں حفاظت اور حفظان صحت کے ضابطوں کی خلاف ورزی پر ان کو مزدوروں کے حقوق کی خلاف ورزی پر قصوروار ٹھہرانے کے کارروائی متاثر ہوتی ہے۔

بین الاقوامی اور ملکی کمپنیاں جو ملبوسات اور دیگر چیزیں پاکستان سے تیار کرواتی ہیں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مزدوروں کی حفاظت اور ان کے حقوق کو ملبوسات کی تیاری سے لیکر ان کی سپلائی تک یقینی بنائیں۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والے حالات جن کا اس رپورٹ میں ذکر کیا گیا ہے نہ صرف پاکستانی قوانین کے منافی ہیں بلکہ بین الاقوامی برانڈ اور مال فروخت کرنے والوں کے معیار جس کے لیے وہ اصرار کرتے ہیں اس پر بھی پورا نہیں اترتے۔

اقوام متحدہ کے کاروبار اور انسانی حقوق کے رہنماؤں، مالکان اور ان کمپنیوں (جو مال خریدتی ہیں) کی بھی ذمہ داری ہے کہ فیکٹریوں میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو روکیں اور ایسی خلاف ورزیاں ہونے کی صورت میں ان کی اصلاح کریں۔ تمام کاروباری اداروں کو اپنے حجم اور اس بات کے کہ وہ کہاں واقع ہیں سے قطع نظر انسانی حقوق کے مخالف کسی کارروائی میں نہ تو شریک ہونا چاہیے نہ ہی اس میں معاون ہونا چاہیے اور ایسی خلاف ورزیاں وقوع پذیر ہونے کی صورت میں ان کی تلافی کرنی چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ وہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو روکیں اور ان کے اثر کو کم کریں خاص طور پر جب ان کا تعلق ان کے کام کرنے، پیداوار یا کاروباری تعلقات کے ساتھ ہو چاہے وہ اس میں کسی طور پر معاون بھی نہ رہے ہوں۔ بہت سی ملکی اور بین الاقوامی کمپنیاں جو پاکستان میں کاروباری سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اپنی ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر رہی ہیں۔

کلیدی سفارشات

- پاکستان کی وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو متعلقہ لیبر قوانین پر نظر ثانی کرنی چاہیے تا کہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ وہ بین الاقوامی معیار کے مطابق ہیں۔ پاکستان انڈسٹریل ریلیشنز ایکٹ 2012 اور صوبائی قوانین بین الاقوامی لیبر تنظیم (آئی ایل او) بشمول کنونشن نمبر 87 برائے آزادی انجمن سازی۔ کنونشن نمبر 98 حقوق برائے اجتماعی سودا کاری و تنظیم جن کی پاکستان نے توثیق کی ہوئی ہے کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔
- پاکستان کی وفاقی حکومت کو چاہیے کہ وہ مزدوروں کی شکایات کی بابت بدسلوکی، مار پیٹ دھمکیاں، ہتک آمیز رویوں کے بارے میں موثر اور غیر جانبدار تفتیش کروائے اور ذمہ داران کے خلاف مقدمات چلائے۔
- پاکستان کی صوبائی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ لیبر انسپکٹروں کی تعداد میں اضافہ کرے ان کی تربیت کو بہتر بنائے اور آزاد اور معتبر معائنہ کا نظام قائم کرے اور اپنے وسائل کے مطابق موثر معائنوں کی تعداد میں اضافہ کرے۔
- ملکی اور بین الاقوامی کمپنیاں جو پاکستان میں مال تیار کرواتی ہیں کو چاہیے کہ وہ مال فراہم کرنے والی فیکٹریوں کی فہرست کو عام لوگوں کے علم میں لائے۔ اس سلسلے میں انہیں چاہیے کہ وہ مزدوروں کی شکایات کے ازالہ کے لیے اقدامات اٹھائیں اور ایک ایسا نظام مرتب کریں جس میں مزدوروں کو انجمن سازی کی آزادی ہو۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ہیومن رائٹس واچ)

جہدحق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔

جو خامیاں / کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔

- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ / اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کر سکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہدحق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتہ تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تا کہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جا سکے۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

جہدحق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے نیچے دی گئی ویب سائٹ پر موجود ہیں

www.hrcp-web.org

جدید غلامی کا مختصر جائزہ

تعارف

غلامی انسانی حقوق کا پہلا معاملہ تھا جس کے متعلق عالمی سطح پر وسیع پیمانے پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ تاہم، عالمگیر مذمت کے باوجود، غلامی سے ملتی جلتی روایات بیسویں صدی کے آخری برسوں میں ایک سنگین مسئلے کی شکل میں بدستور رائج رہیں۔

غلاموں کی تجارت اور غلامی کے خاتمے کے 1926 کے کنونشن کے مطابق غلامی سے مراد 'کسی فرد کی ایسی حیثیت یا حالت ہے کہ دیگر فرد/افراد اس کی ذات پر ملکیت کا دعویٰ کرتے ہوئے متعلق جزوی یا مکمل اختیارات استعمال کریں'۔ برطانیہ نے غلامی کے خاتمے کے ایکٹ 1833 کے ذریعے غلامی ختم کی جس کے نتیجے میں غلامی کے خاتمے کی عالمی تحریک شروع ہوئی۔ تاہم، غلامی کا خاتمہ نہیں ہوسکا۔ اس وقت یہ پہلے سے کہیں زیادہ گھناؤنی شکلوں میں رائج ہے اور دنیا کے ہر ملک کے لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ عورتیں جسم فروشی پر مجبور کی جارہی ہیں، مرد شعبہ زراعت یا تعمیرات میں جبری کام کرنے پر مجبور ہیں، بچوں سے بیگار خانوں میں محنت کروائی جارہی ہے، اور لڑکیوں کو بڑی عمر کے لوگوں کے ساتھ زبردستی بیاہا جارہا ہے۔ ہر ایک وقوعے میں، متاثرین کی زندگیوں کو ان کا استحصال کرنے والوں نے کنٹرول کر رکھا ہے؛ انہیں کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

جدید غلامی ایک سنگین اور اکثر اوقات پس پردہ سرزد ہونے والا جرم ہے جس میں مجرمانہ مفاد کے لیے لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ یہ جرم غلامی، بیگار، جبری و لازمی غلامی اور انسانی اسمگلنگ پر مشتمل ہے۔ اس میں متاثرہ فرد کے انسانی حقوق کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے کسی دوسرے فرد کے فائدے (عام طور پر مالی مفاد) کے لیے یا مفاد کی نیت سے استعمال کیا جاتا ہے یا اس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ متاثرین کی حالت زار کا فائدہ اٹھانے والے مجرمان ذاتی حیثیت سے چھوٹے پیمانے پر کاروبار چلا رہے ہوں یا وہ کسی منظم جرائم پیشہ نیٹ ورک کا حصہ ہوں۔

جدید غلامی کی بنیادی خصوصیات

دنیا بھر میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنے کام کار کے حالات کے حوالے سے انسانی حقوق کی پامالیوں اور ناانصافیوں کا سامنا کر رہی ہے۔ اس دستاویز نے ذیل میں بیان کیے گئے ایسے حالات کی نشاندہی کی گئی ہے جو 'جدید غلامی' کی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔

- ان حالات کا شکار فرد اس صورت حال سے چھٹکارا نہیں پا سکتا؛
- متاثرہ افراد کو اپنی حالت زار ختم کرنے کے لیے کسی قسم کی مدد یا معاونت میسر نہیں ہوتی؛
- یہ صورتحال مسلسل جاری رہتی ہے بجائے اس کے کہ کوئی ایک واقعہ پیش آئے یا الگ تھلگ واقعات کا سلسلہ چلے؛
- متاثرہ افراد کو تشدد کا نشانہ بننے کا خطرہ ہر وقت لاحق رہتا ہے، ان لوگوں کی طرف سے جن کا ان پر کنٹرول ہوتا ہے؛

جدید غلامی کی شکلیں

جدید غلامی کی کئی شکلیں ہیں۔ دنیا کے مختلف علاقوں میں غلامی کی مختلف شکلیں رائج ہیں اور یہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ انسانی اسمگلنگ جدید غلامی کا بنیادی جزو ہونے کی حیثیت سے اس حوالے سے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ انسانوں کی اسمگلنگ (ٹی ایچ بی) ایک ایسا جرم ہے جس سے انسانی حقوق کے کئی پہلو جڑے ہوئے ہیں۔ متاثرہ فرد کے استحصال کی خاطر اسے بھرتی کیا جاتا ہے اور پھر اسے کسی دوسری ریاست یا ریاست کے اندر اسمگل کیا جاتا ہے۔ انسانی اسمگلنگ کے متاثرین اپنی عمر اور صنف کی بنیاد پر مختلف طرح کے استحصال کا نشانہ بنتے ہیں۔ یہ تاثر عام ہے کہ ٹی ایچ بی کے ذریعے عورتوں اور لڑکیوں کا جنسی استحصال کیا جاتا ہے۔ استحصال کی یہ قسم انسانی اسمگلنگ کے لیے بنیادی محرک کا کام کرتی ہے۔ البتہ، انسانی اسمگلنگ کی اور بھی وجوہات ہیں اور اس سے عورتیں اور مرد دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ ٹی ایچ بی کے دیگر مقاصد میں بیگار خانوں میں کام، گھریلو مشقت، کھیتوں، کانوں، فیکٹریوں میں کام اور ماہی گیری، جبری شادی، اعضا کی پیوندکاری، کھیل، (مثال کے طور پر اونٹوں کی دوڑ)، بچوں کو گود لینا اور بھیک شامل ہیں۔

> ہر ایک کیس میں، متاثرین کی زندگیوں کو ان کا استحصال کرنے والوں نے کنٹرول کر رکھا ہے؛ انہیں کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کے مطابق، جدید غلامی کی چھ واضح اقسام ہیں اور ہر ایک قسم میں متاثرہ فرد کے استحصال کی خاطر اسے بیرون ملک یا اندرون ملک اسمگل کیا بھی جاسکتا ہے اور نہیں بھی کیا جاسکتا۔ ان اقسام میں درج ذیل شامل ہیں:

1۔ بچوں کی مشقت: جدید غلامی کی اس قسم میں مزدور کی عمر کام کرنے کی قانونی عمر سے کم ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے استحصال کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں کیونکہ بچوں کی طرف سے کم تنخواہوں اور کام کے برے حالات کے خلاف احتجاج کا امکان کم ہوتا ہے بنسبت بالغ مزدوروں کے۔

2۔ گروی مشقت: اس قسم کی غلامی میں فرد کو قرضے کی واپسی کے لیے ایک آلے کے طور پر کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مزدور کو اکثر ان کے کام کے 'معاوضے' کے طور پر بنیادی خوراک اور رہائش دی جاتی ہے، مگر ہوسکتا ہے کہ وہ کبھی بھی قرضے کی ادائیگی نہ کرسکیں اور اس طرح وہ قرضہ ان کی اگلی نسلوں کو منتقل ہوجاتا ہے۔

3۔ جبری مشقت: غلامی کی یہ قسم ان لوگوں کو متاثر کرتی ہے جنہیں افراد، حکومتیں، یا سیاسی جماعتیں غیر قانونی طریقے سے بھرتی کرتی ہیں اور ان سے ان کی منشاء کے خلاف کام لیا جاتا ہے۔ غلامی کی اس شکل کے متاثرین کو اکثر تشدد اور دیگر سزاؤں کی دھمکی دی جاتی ہے اور عمومی طور پر انہیں ان کے کام کا بہت کم معاوضہ ملتا ہے یا ملتا ہی نہیں۔

4۔ جبری شادی: غلامی کی اس شکل کا نشانہ لڑکیاں اور عورتیں بنتی ہیں جنہیں کہا جاتا ہے کہ انہیں فلاں مردوں کے ساتھ شادی کرنی ہے اور اس حوالے سے انہیں اپنا انتخاب کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ ان میں سے کئی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ ان کے شوہر غلاموں جیسا سلوک کرتے ہیں اور وہ اکثر اوقات جسمانی تشدد کا نشانہ بنتی ہیں۔

5۔ نسل کی بنیاد پر غلامی: غلامی کی یہ شکل ایسے لوگوں کو متاثر کرتی ہے جو ایک ایسے 'گروہ' میں پیدا ہوتے ہیں جن کے بارے میں معاشرہ سمجھتا ہے کہ ان سے غلامانہ مشقت لینا مناسب ہے۔ اس 'گروہ' کی بنیاد طبقے، نسل یا لسانیت پر ہوسکتی ہے۔ اس گروہ میں پیدا

ہونے والے لوگ زندگی بھر امتیاز کا نشانہ بنتے ہیں اور انہیں اپنے کام یا آجر کا انتخاب کرنے کی آزادی نہیں ہوتی۔

6۔ جنسی غلامی: غلامی کی اس شکل کا نشانہ لڑکیاں اور عورتیں بنتی ہیں، مگر بعض اوقات لڑکے بھی بنتے ہیں۔ انہیں جنسی افعال انجام دینے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ عموماً انہیں کمروں میں بند کر دیا جاتا ہے اور جسمانی وجنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے یا نشانہ بنائے جانے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ درحقیقت، مرضی کے بغیر جنسی اختلاط ریپ ہے۔

غلامی، اسمگلنگ اور کنٹرول

جدید غلامی کی کئی اقسام میں انسانی اسمگلنگ کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ لوگوں کو ان کے ملک کے اندر یا دیگر ملکوں اور براعظموں میں اسمگل کیا جاتا ہے، بعض اوقات جبری طور پر، تاکہ انتہائی سخت حالات میں ان سے تضحیک آمیز کام کروایا جائے۔ جب لوگوں کو بیرونِ ممالک منتقل کیا جاتا ہے تو اکثر اوقات وہ تن تنہا ہوتے ہیں، مقامی زبان نہیں بول سکتے اور سماجی وقانونی امداد کے ذرائع سے محروم ہوتے ہیں۔ اسمگلر عموماً ان کی شناختی دستاویزات ضبط کر لیتے ہیں۔ اپنی دستاویزات تک رسائی نہ ہونے اور اپنے علاقے سے دور ہونے کی وجہ سے، آزادی کے لیے فرار مشکل اور پُرخطر ہوتا ہے۔ بعض اسمگل شدہ بچوں کو اغواء کیا گیا ہوتا ہے۔ مگر یہ رجحان بھی عام ہے کہ والدین اپنے بچوں کے بہتر معاشی مستقبل کے لیے خود ان کی اسمگلنگ کی اجازت دیتے ہیں اور بعض خاندان غربت کے باعث ایسا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اسمگلرز اکثر لوگوں کو یہ دھوکہ دیتے ہیں کہ ان کے بچوں کو اپنی حالت بہتر کرنے کا موقع ملے گا۔ غربت اور انتہائی مایوسی دھوکہ دہی کے لیے سازگار حالات پیدا کرتے ہیں۔

جدید غلامی سے مستفید کون ہوتے ہیں؟

غلامی کا زیادہ تر ملکوں کی قومی معیشت پر کوئی کردار باقی نہیں رہا۔ البتہ، یہ کئی ممالک میں مجرمانہ تجارت میں ملوث چھوٹے گروہوں کو دولت مند بنا سکتی ہے۔ آج کے دور میں غلامی دنیا بھر میں غیر قانونی ہے۔ موجودہ دور کے غلاموں کو قانونی طور پر ملکیت میں نہیں لیا جاتا۔ انسانوں کی کھلے عام خرید وفروخت موجودہ غلامی سے تبدیل ہوگئی ہے جس میں لوگوں کو تشدد اور دیگر ذرائع سے کنٹرول کیا جاتا ہے تاکہ پیسے کمانے کے لیے انہیں استعمال میں لایا جا سکے۔ عام طور پر یہ پائیدار نہیں ہوتی مگر متاثرین کو کم ہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی آزادی پر جبری بندش کب ختم ہوگی، چنانچہ یہاں تک کہ قلیل مدت کی غلامی بھی انتہائی المناک نتائج برآمد کر سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر غلامی کی فراہمی کے ذرائع کے خاتمے کے لیے طریق ہائے کار دستیاب نہ ہوں تو حکومت اور عام صارف بھی غلامی سے مستفید ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب حکومت ان بھٹوں سے اینٹیں لیتی ہے جو گروی مزدوروں سے کام کرواتے ہیں تو وہ سستی پیداوار سے مستفید ہوتی ہے۔ یہی کام صارفین اور شہری کرتے ہیں۔ ہم سب اس میں ملوث ہیں۔

آج کے دور میں غلاموں کی تعداد کتنی ہے

جب غلامی کو قانونی حیثیت حاصل تھی اور اسے کھلے عام تسلیم کیا جاتا تھا تو اس وقت غلاموں کی تعداد جاننا آسان تھا۔ اب چونکہ غلامی غیر قانونی ہے اور خفیہ طریقے سے رائج ہے، اس لیے ان کی تعداد کے بارے میں جاننا قدرے مشکل ہے۔ غلامی کے محققین مختلف تعریفات استعمال کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے مختلف اعداد وشمار پیش کیے ہیں۔ 2002 میں، غلاموں کو آزاد کرو نامی تنظیم کے صدر کیون بیلر نے 100 سے زائد ممالک میں غلاموں کی تعداد دشمار کی۔ ان کا اندازہ تھا کہ آج کی دنیا میں تقریباً دو کروڑ، ستر لاکھ افراد غلام ہیں۔ 2005 میں عالمی ادارہ صحت (آئی ایل او) نے بھی اسی طرح کے عالمی سروے کا اہتمام کیا۔ سروے کے مطابق کم از کم ایک کروڑ 23 لاکھ افراد غلامی کا شکار تھے۔ ہوسکتا ہے کہ غلاموں کی قطعی تعداد کبھی بھی معلوم نہ ہو سکے مگر یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ دنیا بھر میں کروڑوں لوگ غلامی کا شکار ہیں۔ دو کروڑ ستر لاکھ سے کہیں زیادہ لوگ دنیا بھر میں استحصال کا نشانہ بن رہے ہیں۔ کئی لوگ سخت ترین حالات میں طویل وقت تک کام کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ انہیں ان کی محنت کا صلہ نہیں ملتا۔ بچے اور نوجوان، خاص طور پر غریب ملکوں میں، محسوس کرتے ہیں کہ ان کے خاندان روزمرہ بنیادوں پر انہیں جو کام سونپتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو انہیں اپنے خاندان کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے کیا جانا چاہیے۔ لفظ 'غلامی' اس طرح کے حالات کو بیان کرنے کے لیے عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مگر غلاموں اور ایسے لوگوں کے بارے میں اہم فرق جو غلام نہیں ہیں مگر ان کے ساتھ بُرا سلوک ہوتا ہے اور بری طرح استحصال ہوتا ہے، اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ دیگر مواقع کے حصول کے لیے اپنی صورت حال سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک مزدور کے لیے عام طور پر ممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی اور ملازمت کے لیے تشدد کے خطرے کا سامنا کیے بغیر اپنے آجر کو چھوڑ سکے۔ موجودہ دور کے غلاموں کو اپنے آجر کو چھوڑنے کی کوشش پر بھی سخت سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر وہ چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اکثر ان کا تعاقب کیا جاتا ہے اور واپس بیگار خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

مختلف ممالک میں جدید غلامی کا تاثر

دولت مند ملکوں میں کم لوگ غلامی کا شکار ہیں مگر جو غلامی کا شکار ہیں انہیں جبری جسم فروشی کا نشانہ بنائے جانے کے زیادہ امکانات ہیں۔ غریب ملکوں میں زیادہ لوگ غلام ہیں مگر وہاں جبری جسم فروشی کا نشانہ بننے والوں کی تعداد دیگر جبری مزدوروں کے مقابلے میں کم ہے۔ جدید غلامی کا نشانہ بننے کے امکانات کا شہریتی حیثیت کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔ غلامانہ سلوک کا نشانہ بننے والوں کی بڑی تعداد تارکین وطن مزدوروں پر مشتمل ہے جن کی ترکِ وطنی کی حیثیت محفوظ نہیں جس کی وجہ سے وہ استحصال و بدسلوکی کی صورت میں مدد کے لیے حکومتی اہلکاروں سے رجوع کرنے سے ڈرتے ہیں۔ وہ اکثر اپنی مرضی سے ہجرت کرتے ہیں مگر دھوکہ دہی پر مبنی معلومات کی بنیاد پر۔ جب وہ منزل مقصود پر پہنچتے ہیں تو انہیں وہاں پہنچانے والے لوگ یا ادارے اپنا عہد توڑ دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ مزدور غلامی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں کیونکہ انہیں سفری اخراجات کے لیے لیا گیا قرضہ واپس کرنے کے لیے مشقت کرنا پڑتی ہے۔

جدید غلامی کا سلسلہ کیوں رواں دواں ہے؟

ملکوں نے غلامی کی روک تھام کے لیے قوانین منظور کیے اور عالمی معاہدوں پر دستخط کیے ہیں مگر ان قوانین پر اکثر عملدرآمد نہیں کیا جاتا۔ حکام جانتے ہیں کہ غلامی رائج ہے مگر وہ اس کے خاتمے کے لیے ٹھوس اقدامات نہیں کرتے۔

مثال کے طور پر پاکستان نے 1995 میں گروی مشقت کے خلاف قوانین منظور کیے تھے مگر ابھی تک کسی کو سزا نہیں ملی اور گروی مشقت جاری ہے۔ ہندوستان میں بھی اس طرح کے قوانین ہیں جو معمولی جرمانوں کے علاوہ کسی کو بھی قید کی سزا دلوانے میں ناکام ہیں۔ کئی ملکوں نے انسانی اسمگلنگ کے خلاف سخت قانون سازی کی ہے مگر عورتوں اور لڑکیوں کی کینیڈا، امریکہ، برطانیہ اور دیگر یورپی ملکوں میں اسمگلنگ کا سلسلہ جاری ہے جہاں انہیں جسم فروشی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

امریکہ کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے اندازوں کے مطابق 17,500 افراد کو ہر سال امریکہ لایا جاتا ہے تاکہ اُن سے مختلف قسم کی جبری مشقت کروائی جائے، خاص طور پر زرعی کام، جسم فروشی، گھریلو خدمت یا بیگار خانوں میں مشقت۔ دنیا کا امیر ترین اور طاقتور ملک اس عمل کی مؤثر روک تھام میں ناکام ہے یا اس کے لیے آمادہ نہیں۔ غلامی مخالف عوامی شعور

اور سماجی ایکٹوازم پر یقین رکھنے والے کارکنوں کا کہنا ہے کہ غلامی کے خلاف قوانین کے نفاذ کے لیے عوام کے شعور و تعلیم میں اضافہ، نیز سرکاری اقدامات ضروری ہیں۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ غلامی سے چھٹکارا پانے والوں کو معاشی، عملی اور نفسیاتی امداد کی ضرورت ہے تاکہ وہ دوبارہ غلامی کے چنگل میں نہ پھنس جائیں۔ جیسا کہ 19 صدی میں ہوا، سابقہ غلام جو کامیابی کے ساتھ بحالی نو کے عمل سے گزرے، موجودہ غلامی کے خلاف طاقتور مہم جو ثابت ہو سکتے ہیں۔ آج کی غلامی عام طور پر پس پردہ ہے۔ بہت سے لوگوں کو شاید یہ احساس بھی نہیں ہے کہ یہ جاری ہے، کن علاقوں میں اور کس طرح جاری ہے یہ جاننا تو دور کی بات ہے۔ مگر لوگوں کے پاس یہ معلومات ہوں تو پھر وہ مہم چلا کر مثبت پیش رفت لا سکتے ہیں۔ اگر سکول کے طالب علموں کو پتہ چل جائے کہ اُن کے دیگر ہم عُمر بچوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے تو ممکن ہے کہ وہ آج کے دور کے غلاموں کو آزادی دلانے کے لیے خود اپنے خیالات کی بنیاد پر مہم چلانے کے لیے آمادہ ہو سکتے ہیں۔

جدید غلامی کا مقابلہ

1990 کی دہائی تک یہ سوچ عام تھی کہ غلامی قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ مگر اِس خود تسکین خیال کو انسانی حقوق کے کارکنوں نے چیلنج کر دیا ہے جنہوں نے لوگوں کو یہ احساس دلایا ہے کہ موجودہ غلامی کی کئی شکلیں بدستور موجود ہیں۔ 100 سے زائد حکومتوں نے غلامی کے خلاف نئے قوانین مرتب کیے ہیں، خاص طور پر گلوبل ساؤتھ میں جہاں موجودہ غلامی کے کئی متاثرین مقیم ہیں، غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) ان معاملات کو اجاگر کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ قدرے پرانی این جی اوز جیسے کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس واچ نے دنیا بھر میں انسانی حقوق کی وسیع تر سرگرمیوں میں موجودہ غلامی کی مثالوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔

ماضی میں انسداد غلامی کے حامیوں سے لے کر۔۔۔

غلامی کی تاریخی مخالفت کے دو ذرائع تھے: افریقی غلام، اور انسداد غلامی کے حامی (وہ لوگ جو خود تو غلام نہیں تھے مگر غلامی کے خاتمے کے لیے پرعزم تھے)۔ غلاموں کو درپیش خطرات کے باوجود، کھیتوں اور اراضیوں پر کام کرنے والے غلاموں نے کئی بار بغاوت کی۔ کچھ غلام اُن علاقوں میں آباد ہو گئے جو برطانوی تسلط سے آزاد تھے۔ دیگر نے اسلحہ اٹھایا اور میدان جنگ میں اپنی آزادی کو یقینی بنایا۔ جہاں کہیں بھی غلامی کا خاتمہ ہوا، غلام اور سابقہ غلام دونوں کہانی کے مرکزی کردار تھے۔ بحر اوقیانوس پار غلامی کا مقصد نو آبادیوں کا حصول اور اُنہیں برقرار رکھنا، سلطنتوں کا استحکام، اور آبائی وطن میں صنعت کو مضبوط کرنا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ غلامی کے خاتمے کے حامی طاقتور معاشی مفادات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ غلاموں کے مالکان کا دعویٰ تھا کہ غلامی معاشی و مذہبی نقطہ نظر سے جائز ہے۔ غلامی کے خاتمے کے حامیوں کی مہم کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور قانون سازوں نے غلامی کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد غلامی اور غلامی سے ملتی جلتی سرگرمیاں اور جبری مشقت اُن معاملات میں سرفہرست تھیں جو لیگ آف نیشنز کی توجہ کا مرکز بنے۔ رائے عامہ کی تبدیلی اور جغرافیائی حکمت عملی سے متعلق معاملات اِس موضوع پر توجہ بڑھانے کا سبب بنے۔

اگرچہ، 1833 میں پارلیمان کے قانون کے ذریعے سلطنت برطانیہ میں غلامی ختم کر دی گئی، مگر ریاستوں کو غلاموں کی تجارت اور غلامی سے معاشی مفاد اٹھانے کا سلسلہ جاری رکھنے کی اجازت سے برطانیہ کے تجارتی مفادات بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو سکتے تھے۔ غلامی کو بے نقاب کرنے اور اس کی مخالفت کرنے والی تحریک نے کئی حکمتِ عملیاں اور تدابیر اپنائیں:

☆ سابقہ غلاموں نے غلامی کے خلاف اپنا مقدمہ مضبوط کرنے کے لیے اپنی تقریروں اور تحریروں میں پُر اثر شواہد پیش کیے۔

☆ غلامی کے انسداد کے حامیوں نے غلامی کے خلاف مضامین اور پمفلٹ تیار کیے اور خطبے اور لیکچر دیے۔

☆ لوگوں نے پٹیشنوں پر دستخط کیے جن میں غلامی کے خاتمے کا مطالبہ کیا گیا۔

☆ لوگوں نے ان مصنوعات کا بائیکاٹ کا جنہیں غلام مزدوروں نے تیار کیا تھا، مثال کے طور پر 300,000 افراد نے چینی کا بائیکاٹ کیا جو ان صنعتوں سے تیار ہو رہی تھی جنہیں غلام مزدور چلا رہے تھے، پمفلٹ تقسیم کئے گئے جن میں لوگوں کو کہا گیا کہ وہ صرف آزاد مزدوروں کی محنت سے تیار ہونے والی چینی استعمال کریں۔

☆ عورتوں نے ایسی اشیاء خریدیں جن پر جھکے ہوئے، زنجیروں میں جکڑے افریقی غلاموں کی تصویریں تھیں۔ انہیں چوڑیوں اور بال پنوں میں استعمال کیا گیا تاکہ غلامی کے خاتمے کی حمایت کی تشہیر ہو۔

☆ امریکہ میں، زیر زمین ریلوے، کارکنوں نے بھاگ جانے والے غلاموں کو محفوظ مقام تک پہنچانے اور ان کی زندگیوں کی تعمیر نو میں ان کی مدد کی۔ غلامی کے بعض مخالفین نے بچ نکلنے والے غلاموں کو اپنے گھروں میں 'ٹھہرنے' کی اجازت دی تاکہ ان کے لیے مناسب خوراک، پناہ اور پیسوں کا بندوبست ہو سکے۔ بعض نے 'کنڈکٹرز' کا کام کیا۔ اور غلاموں کو ویگنوں یا تانگوں میں سوار کر کے اسٹیشنوں پر تعینات اہلکاروں سے چھپا کر محفوظ مقامات پر منتقل کیا۔

آج کے کارکنوں تک۔۔۔۔

جدید غلامی کے خلاف کام کرنے والے کارکن ان حکمتِ عملیوں کا جدید طریق ہائے کار کے تحت استعمال کر رہے ہیں، مثلاً اخبارات اور ویب پر مضامین، اطلاعات، غلامی کے شکار لوگوں کے متعلق حالیہ شواہد، فلمیں، پٹیشنیں اور احتجاجی مظاہرے۔

غلامی مخالف انٹرنیشنل نے حال ہی میں 'کاٹن کرائمز' پر ایک تحریک شروع کی ہے جس کا مقصد ازبکستان میں کپاس کی صنعت میں بچوں سے غلامانہ مشقت کا خاتمہ ہے۔ ازبکستان کپاس برآمد کرنے والا دنیا کا تیسرا بڑا ملک ہے مگر کپاس کی کٹائی کے تین ماہ کے دورانیے میں بچوں سے مشقت لی جاتی ہے۔ زیادہ تر ازبک کپاس یورپی منڈی میں بیچی جاتی ہے۔ اس تحریک کے تحت پورے یورپ کی سطح پر ایک پٹیشن پیش کی گئی ہے، یورپی پارلیمان کے اراکین کو خطوط لکھنے کا اہتمام کیا گیا اور دوکانداروں کو کہا گیا کہ وہ تھوک فروشوں کو خطوط لکھ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ وہ کپاس سے بنی جو مصنوعات فروخت کر رہے ہیں کہیں وہ غلامانہ مشقت سے تو نہیں بن رہیں۔

غلامی مخالف انٹرنیشنل کی دوسری تحریک کا نام 'ہوم الون' ہے جس کا مقصد عوام کو گھریلو ملازمین جن میں سے کئی جدید غلامی کا شکار ہیں، کی حالت زار سے آگاہ کرنا اس طرح کی غلامانہ سرگرمیوں کو چیلنج کرنا ہے۔ فیکٹ شیٹوں اور پوسٹرز اور گھریلو ملازمین کے ویڈیو کلپس جن میں وہ اپنی کہانیاں بتاتے ہیں، کے ذریعے عوام کو آگہی دی جاتی ہے۔

فیئر ٹریڈ فاؤنڈیشن اور گڈ ویو ایسی مثالیں ہیں جن کے ذریعے صارفین سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے ان لوگوں کے منافع کی راہ میں حائل ہوں جو اپنے منافع کے لیے غلامانہ مشقت کا استعمال کرتے ہیں۔ اپنی مصنوعات کے لیے شفاف تجارت کا لیبل لینے کے خواہاں صنعتوں کو یقینی بنانا ہوگا کہ ان کی مصنوعات کی تیاری میں جبری مشقت یا بچوں کی مشقت کا استعمال نہ ہو۔ برطانیہ اور دیگر ملکوں میں کارکن اپنے مقامی علاقے کے لیے 'شفاف تجارت ٹاؤن' کا رتبہ حاصل کرنے کے لیے سرگرم عمل ہیں اور صارفین کو آگہی دینے اور قائل کرنے کے لیے سالانہ مہم ''شفاف تجارت پندرھواڑہ'' پر اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں۔ گڈ ویو جنوبی ایشیا میں ہاتھ سے بنے غالیچے کی

صنعت کو سرٹیفکیٹ جاری کرتی ہے۔ گڈ ویو لیبل اس چیز کو یقینی بناتا ہے کہ پیداوار کے لیے بچوں سے مشقت نہ کروائی جائے۔

بانڈ لیبر لبریشن فرنٹ اور بچپن بچاؤ اندولن جیسی براہ راست اقدام کرنے والی تحریکیں اور مہم جُو بھی ہیں جو جدید غلاموں کو ان علاقوں سے بازیاب کروانے جہاں انہیں رکھا جاتا ہے، اور ان کی زندگیوں کی تعمیرِ نو میں ان کی مدد کرتی ہیں۔

وہ بچوں کو غیر قانونی مشقت سے آزاد کروانے کے لیے کیے جانے والے خفیہ آپریشن 'چھاپوں' کے ساتھ ساتھ لابنگ اور احتجاجی مظاہروں کے ذریعے عوامی مہمات چلانے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ گزشتہ صدیوں کی طرح وہ لوگ جو غلامی کا شکار ہیں یا رہے ہیں، انصاف کی مہموں کو پراثر بنانے کا کام کر رہے ہیں۔ جدید غلامی سے چھٹکارا پانے والے کئی افراد نے اپنے حامی گروپ تشکیل دیے ہیں یا ان میں شامل ہو گئے ہیں اور ان لوگوں کی آزادی اور وقار کے لیے سرگرم عمل ہیں جو ابھی تک غلامی کا شکار ہیں۔

اگرچہ بحر او قیانوس پار غلامی کو انیسویں صدی میں غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا مگر یہ تسلیم کیا گیا کہ غلامی کی کئی اقسام بدستور رائج ہیں چنانچہ بیسویں صدی میں نئے قوانین کی ضرورت تھی۔

ذیل میں ان عالمی و علاقائی قوانین کا تاریخ وار ذکر کیا گیا ہے جو غلامی کے خاتمے کے لیے گزشتہ 10 برسوں میں منظور کیے گئے۔

جدید غلامی کے خلاف قانون سازی کا تاریخ وار بیان

1926	لیگ آف نیشنز کا غلامی کنونشن حکومتوں کو پابند بناتا ہے کہ وہ 'غلامانہ تجارت کی روک تھام کریں اور اس پر قابو پائیں، اور اس امر کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ 'جبری مشقت کو غلامی سے ملتے جلتے حالات میں تبدیل ہونے سے روکنے' کی ضرورت ہے۔
1930	جبری مشقت پر آئی ایل او کنونشن کے مطابق جبری مشقت سے مراد ایسا کوئی بھی کام اور خدمت ہے جو کسی فرد سے سزا کی دھمکی دے کر غیر رضا کارانہ طور پر لی جائے۔ تاہم، کنونشن اور آئی سی سی پی آر کے تحت جبری مشقت کی ممانعت سے بعض استثناء موجود ہیں۔ مثال کے طور پر، جیل میں کی جانے والی مشقت کو جبری مشقت کی ممانعت سے استثناء حاصل ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو کہ طویل عرصہ سے انسانی حقوق کے عالمی قانون کی نظروں سے اوجھل ہے۔
1948	انسانی حقوق کا عالمی منشور (آرٹیکل **4**) کے مطابق، کسی فرد کو نہ تو غلام بنایا جائے گا اور نہ اس سے بیگار لی جائے گی۔ غلامی اور غلاموں کی شکل جو کوئی بھی ہو، اس پر پابندی ہے۔
1949	انسانی سمگلنگ اور دوسروں کی جسم فروشی کے منفعت کی ممانعت کا یو این او کنونشن کی رو سے جسم فروشی کے ذریعے تجارتی جنسی منفعت پر پابندی ہے۔
1950	انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے تحفظ کے لیے یورپی کنونشن (یورپی کونسل) (آرٹیکل **4**) کے مطابق "کسی فرد کو نہ تو غلام بنایا جائے گا اور نہ ہی اس سے بیگار لی جائے گی" اور کسی بھی فرد کو جبری یا لازمی مشقت کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔
1953	**25** ستمبر **1926** کو جنیوا میں منظور ہونے والا غلامی کے خاتمے کے کنونشن میں ترمیم کرنے والا اقوام متحدہ کا پروٹوکول کی رو سے لیگ آف نیشنز پر پابندی کے کنونشن میں ذمہ داریاں اقوام متحدہ کو سونپی گئیں۔
1956	غلامی، غلامی کی تجارت، اور غلامی سے ملتے جلتے اداروں اور سرگرمیوں کے خاتمے کے لیے اقوام متحدہ کا ضمنی کنونشن نے ایسی متعدد سرگرمیوں اور اداروں کی تعریف فراہم کی ہے اور ان کے خلاف قوانین سازی کی ہے جو غلامی سے ملتے جلتے ہیں، خاص طور پر، گروی مشقت، غلامی، جبری شادی، اور استحصال کی خاطر بچوں کی منتقلی۔
1957	جبری مشقت کے خاتمے سے متعلق آئی ایل او کنونشن (نمبر **105**) حکومتوں کو پابند کرتا ہے کہ وہ" کسی بھی قسم کی جبری یا لازمی مشقت" پر قابو پائیں۔
1969	انسانی حقوق پر امریکی ریاستوں کی تنظیم (او اے ایس) کا امریکی کنونشن (آرٹیکل **6**: غلامی سے آزادی) کے مطابق: کسی بھی فرد کو غلام نہیں بنایا جائے اور نہ ہی اسے غیر رضا کارانہ بیگار لی جائے گی۔ ان پر پابندی ہیچا ہے یہ کسی بھی مشکل میں ہوں۔ اس طرح یہ غلاموں کی تجارت اور عورتوں کی اسمگلنگ پر بھی پابندی ہے اور کسی بھی فرد کو جبری یا لازمی مشقت کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ 1950 کے یورپی کنونشن کی طرح اس کنونشن کے تحت بھی حراست جیسے حالات میں مشقت کو استثناء حاصل ہے۔
1981	انسانی و عوامی حقوق پر افریقی یونین (سابقہ، تنظیم برائے افریقی اتحاد، او اے یُو) کا افریقی منشور (آرٹیکل **5**) کے مطابق: ہر قسم کے استحصال اور انسان کی تذلیل، خاص طور پر غلامی، غلامانہ تجارت، ایذا رسانی، ظالمانہ، غیر انسانی یا تضحیک آمیز سزا اور سلوک پر پابندی ہوگی۔
1989	بچوں کے حقوق پر اقوام متحدہ کا کنونشن (آرٹیکل **34** اور **35**) کی رو سے بچوں کو جسم فروشی اور فحش نگاری سمیت ہر قسم کے استحصال سے تحفظ حاصل ہے اور بچوں کا اغواء، فروخت اور اسمگلنگ ممنوع ہے۔
1998	دستور روم برائے عالمی فوجداری عدالت نے ہیگ میں عالمی فوجداری عدالت قائم کی جسے نسل کشی، انسانیت کے خلاف جرائم، جنگی جرائم اور غلامی سمیعلق جرائم کی سماعت کا اختیار حاصل ہے۔
1999	بچوں کی مشقت کی بدترین اقسام کی ممانعت اور ان کے خاتمے کے لیے فوری اقدام سمعلق آئی ایل او کنونشن (**182**) نے، بچوں کی مشقت کی بُری اور استحصالی اقسام امتیاز کرنے کے مسئلے پر قابو پایا ہے اور غلامی، گروی مشقت، جبری مشقت، مسلح افواج کے لیے بھرتی، جسم فروشی اور منشیات کی اسمگلنگ جیسی "بدترین اقسام" کی نشاندہی بھی کی ہے۔
2000	لوگوں خاص طور پر عورتوں اور بچوں کی اسمگلنگ کی روک تھام، خاتمے اور سزا کے لیے یو این کا پروٹوکول (سرحد پار منظم جرم کے خلاف یو این کنونشن **2000** کا حصہ) ریاستوں کو پابند کرتا ہے کہ وہ انسانوں کی اسمگلنگ کی روک تھام کریں اور اس کا مقابلہ کریں، اسمگلنگ کا نشانہ بننے والوں کو تحفظ و مدد فراہم کریں اور ان مقاصد کے حصول کے لیے ریاستوں کے درمیان تعاون کو فروغ دیں۔
2005	انسانوں کی اسمگلنگ کے خلاف اقدام سے متعلق یورپی کونسل کا کنونشن اس کنونشن کا مقصد منفی برابری کو یقینی بناتے ہوئے انسانوں کی اسمگلنگ پر قابو پانا اور اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ متاثرین اور گواہوں کی حفاظت و مدد کرنا بھی اس کا مقصد ہے تاکہ موثر تحقیقات اور قانونی کارروائی کو یقینی بنایا جا سکے۔ انسانی اسمگلنگ کے خلاف عالمی تعاون کا فروغ بھی کنونشن کے مقاصد میں شامل ہے۔
2011	آئی ایل او کنونشن برائے گھریلو ملازمین کا مقصد گھروں میں کام کرنے والے بالغ و کمسن ملازمین کو استحصال سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔
2014	جدید غلامی کا مسودہ قانون برطانوی حکومت نے پارلیمان کو جدید غلامی کے متعلق ایک مسودہ قانون پیش کیا ہے۔

پاکستان میں جدید غلامی

غلامی کے عالمی گوشوارے 2018 کے مطابق، پاکستان 167 ممالک کی فہرست میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ رپورٹ کے مطابق، 3,186,000 افراد گروی مشقت کا شکار ہیں جبکہ ہر 100 میں سے 71.12 افراد کو اس کا نشانہ بننے کا خطرہ لاحق ہے۔ جدید غلامی پر ملکی سطح کے کوائف کے ساتھ، غلامی کے عالمی گوشوارے 2018 میں بعض مخصوص ممالک کے متعلق تحقیقی اعداد و شمار بھی شامل ہیں۔ ذیل کے جدول میں پاکستان میں جدید غلامی کی اقسام اور اس کی زد میں لانے والے عوامل کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ اس میں ان درآمدات کی زیادہ سے زیادہ قدر کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے جن کے بارے میں خدشہ ہے کہ وہ جبری مشقت سے تیار ہوئی ہیں نیز جدید غلامی پر برطانوی ایکٹ کے تحت کیے جانے والے بیانات کے متعلق معلومات بھی ہیں۔ جدول میں پاکستان میں جدید غلامی کے پھیلاؤ کے بارے میں واضح تصویر کشی کی گئی ہے اور حکومتی اقدامات کے حوالے سے کئی مختلف اشاریوں کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ اشاریوں کے درجات حکومتی ردعمل میں واضح کمی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

پاکستان جدید غلامی کے پھیلاؤ کی سطح: **8** / **167**	
جدید غلامی میں جکڑے افراد کی انداز تعداد	3,186,000
انداز کتنے فیصد لوگ جدید غلامی کا شکار ہیں	1000 / 16.82
کتنے فیصد لوگ جدید غلامی کی زد میں آسکتے ہیں	100 / 74.12

حکومت کے ردعمل کا درجہ	C
آبادی	189,389,513
جی ڈی پی (پی پی پی)	$5,246

حکومتی ردعمل

سنگ میل **1**: غلامی سے چھٹکارا پانے والوں کی نشاندہی کی گئی اور ان کی مدد کی گئی تاکہ وہ غلامی سے چھٹکارا پاسکیں اور دوبارہ کبھی اس کا نشانہ نہ بنیں۔

اشاریہ	درجہ
قومی مہمات عوام کو یہ معلومات فراہم کرتی ہیں کہ متاثرین کی اطلاع کیسے دی جائے اور ان کی نشاندہی کیسے کی جائے۔	نہیں
عوام کی جانب سے جدید غلامی کے رپورٹ ہونے والے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔	نہیں
متاثرین کی معاونت کی خدمات جدید غلامی کے تمام متاثرین کے لیے دستیاب نہیں ہیں۔	نہیں
فرنٹ لائن پر 'عام ڈیوٹیاں' انجام دینے والی پولیس کے لیے بنیادی قانونی ڈھانچوں اور متاثرین کی نشاندہی سے متعلق تربیت کا اہتمام کیا گیا ہے۔	ہاں
مبینہ متاثرین کو ان کی مرضی کے خلاف پناہ گاہوں میں رکھا جاتا ہے اور انہیں اس بات کا اختیار نہیں ہوتا کہ آیا انہیں پناہ گاہ میں رہنا ہے یا نہیں۔	نہیں

سنگ میل **2**: فوجداری انصاف کے نظام ہائے کار جدید غلامی پر قابو پانے کے لیے مؤثر طور پر کام کرتے ہیں۔

اشاریہ	درجہ
سنگ میل **2**: فوجداری انصاف کے نظام ہائے کار جدید غلامی پر قابو پانے کے لیے مؤثر طور پر کام کرتے ہیں۔	
افراد، خاص طور پر خواتین اور بچوں کی سمگلنگ کی روک تھام، ممانعت اور سزایابی سے متعلق پروٹوکول جو کثیر الملکی منظم جرم کے خلاف اقوام متحدہ کے معاہدہ، 2000ء کی تکمیل کا سبب بنتا ہے۔	نہیں
آئی ایل او گھریلو ملازمین کا معاہدہ، 2011ء (نمبر 189)	نہیں
بچوں کی جسم فروشی کو جرم قرار دیا گیا ہے	نہیں
اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ جدید غلامی کے متاثرین کے ساتھ ایسے طرز عمل کی بناء پر جو مجرموں کے زیر کنٹرول رہ کر انجام دیا گیا ہو مجرموں جیسا برتاؤ کیا گیا ہے۔	ہاں
عدالتی سزائیں جرم کی شدت اور مجرم کی سزاواری کے لحاظ سے موزوں نہیں ہیں۔	ہاں

سنگ میل **3**: قومی اور علاقائی سطح پر اشتراک پایا جاتا ہے اور حکومتوں کو ان کے ردعمل کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے

اشاریہ	درجہ
حکومت اور این جی اوز پر مشتمل قومی تعاون کی باڈی موجود ہے۔	نہیں
قومی ایکشن پلان واضح اشاریوں اور ذمہ داریوں کی تخصیص کے ساتھ موجود ہے۔	نہیں
قومی ایکشن پلان کے نفاذ اور مؤثر پن کا جائزہ لینے کے لیے ایک آزاد ادارہ موجود ہے۔	نہیں
جدید غلامی سے متعلق معاملات پر اشتراک کے حوالے سے حکومت اور خطے کے ممالک یا ان علاقوں کے درمیان معاہدہ موجود ہے جہاں لوگوں کو سمگل کر کے بھیجا جاتا ہے۔	ہاں
ممالک کے درمیان تارکین وطن محنت کشوں سے متعلق ایسا معاہدہ موجود ہے جو تارکین وطن محنت کشوں کو تحفظ فراہم کرتا ہو	ہاں

سنگ میل **4**: خطرے کے عوامل، جیسے کہ رویوں، سماجی نظام ہائے کار، اور ادارے جو جدید غلامی کی اجازت دیتے ہوں، کا ازالہ کیا جائے۔

اشاریہ	درجہ
حکومت جدید غلامی کے عدم پھیلاؤ پر تحقیق کے لیے فنڈز مہیا کرتی ہے یا اس میں آسانی پیدا کرتی ہے۔	ہاں
حکومت غیر رسمی شعبے میں لیبر سے متعلق معائنے کا اہتمام کرتی ہے تاکہ جدید غلامی کے واقعات کی نشاندہی کی جاسکے۔	نہیں
سرکاری پرائمری تمام بچوں کے لیے تعلیم لسانی وثقافتی یا مذہبی پس منظر سے بالاتر ہو کر دستیاب ہے۔	نہیں
حکومت شہریوں کی واپسی کو شناختی دستاویزات فراہم کرتی ہے اور ان کے سفری انتظامات میں معاونت کرتی ہے۔	نہیں

سنگ میل **5**: حکومت اور کاروباری ادارے ایسی مصنوعات اور خدمات کی سورسنگ روک دیتے ہیں جو جبری مشقت کے ذریعے تیار کی گئی ہوں۔

اشاریہ	درجہ
پبلک پروکیورمنٹ کے عہدے داروں کے لیے ہدایات موجود ہیں۔	نہیں
پبلک پروکیورمنٹ میں جبری مشقت کے استعمال کی روک تھام کے حوالے سے حکومتی اقدامات سے متعلق سالانہ رپورٹس پیش کی جاتی ہیں اور یہ عام دستیاب ہوتی ہیں۔	نہیں
حکومتوں نے زیادہ خطرات والے شعبوں کی نشاندہی کی ہے اور ان شعبوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں تاکہ جدید غلامی کا خاتمہ کیا جاسکے۔	نہیں
حکومتیں سرمایہ کاری کی رقوم اور متعلقہ ممالک میں موجود بینکوں کے لیے ایک ذمہ دارانہ سرمایہ کاری کی رپورٹنگ کی شرط پر عمل درآمد کرتی ہیں تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ سرمایہ کاری جدید غلامی کی حمایت نہ کرے۔	نہیں
ایسے قوانین موجود ہیں جن کے مطابق جو کمپنی ڈائریکٹر یا کمپنیاں جو جدید غلامی پر قابو پانے اور پہلے درجے کی سپلائی چین میں ذمہ دارانہ مناسب اقدامات کرنے میں ناکام رہتی ہیں وہ فوجداری جرم کی مرتکب ہوں گی۔	نہیں

غلامی کی ممانعت: پاکستان میں قانون سازی

آئین پاکستان میں لوگوں کی معاشی اور سماجی بہبود اور سماجی انصاف کے فروغ سے متعلق دفعات موجود ہیں۔ زندگی یا آزادی کے تحفظ، غلامی اور جبری مشقت کی ممانعت سے متعلق بنیادی حقوق، اور انجمنیں اور یونینیں بنانے کا حق، بشمول دیگر، کا آئین میں ذکر کیا گیا ہے۔ تقسیم سے پہلے (1947ء میں پاکستان کی آزادی سے پہلے) بچوں کی جبری مشقت پر قابو پانے کا قانون کا نام 'بچوں (گروی مشقت) کا ایکٹ 1933ء تھا جس کا مقصد ایسے معاہدوں کی ممانعت کرنا تھا جن کے تحت بچوں کی مشقت گروی رکھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس قانون کا مقصد ایسے بچوں کی مشقت کی ممانعت کرنا تھا جن کی مشقت والدین یا سرپرستوں کی جانب سے گروی رکھی جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد کے دور میں، آئین پاکستان کا آرٹیکل 3 اور 11 گروی مشقت کے خاتمے کی ضمانت دیتا ہے اور ریاست کو پابند کرتا ہے کہ وہ ہر قسم کے استحصال کا بتدریج خاتمہ کرے۔ آرٹیکل 11 قرار دیتا ہے کہ غلامی غیر موجود اور ممنوع ہے اور ایسا کوئی بھی قانون نہیں بنایا جاسکتا جو اسے پاکستان میں کسی بھی شکل میں متعارف کرائے جانے کی اجازت دیتا ہو یا اس میں آسانی پیدا کرتا ہو۔

> گروی مشقت کا احاطہ آئین کا آرٹیکل **3** بھی کرتا ہے جو کہتا ہے کہ '**ریاست ہر قسم کے استحصال کے خاتمے اور اس بنیادی اصول کی تدریجی تکمیل کو یقینی بنائے گی کہ ہر ایک سے اس کی اہلیت کے مطابق کام لیا جائے گا اور ہر کسی کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ دیا جائے گا**'۔ چونکہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ گروی مشقت استحصال کا سبب بنتی ہے اور گروی مزدور کو نہ تو اپنی قابلیت کے مطابق کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور نہ ہی اسے اپنے کام کے مطابق معاوضہ ملتا ہے، اس کا خاتمہ ایک آئینی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔

اس حوالے سے جس واحد استثنا کی اجازت ہے وہ ایسی لازمی مشقت ہے جو کسی عدالت کی جانب سے دی گئی سزا کا حصہ ہو، یا پھر ایسا کام جس کا تقاضہ قانون کی جانب سے کسی سرکاری مقصد کی خاطر کیا گیا ہو، مگر اس کے لیے بھی شرط یہ ہے کہ کوئی بھی لازمی سروس ظالمانہ نوعیت کی یا انسانی وقار کے خلاف نہیں ہوگی۔

گروی مشقت کا احاطہ آئین کا آرٹیکل 3 بھی کرتا ہے جو کہتا ہے کہ 'ریاست ہر قسم کے استحصال کے خاتمے اور اس بنیادی اصول کی تدریجی تکمیل کو یقینی بنائے گی کہ ہر ایک سے اس کی اہلیت کے مطابق کام لیا جائے گا اور ہر کسی کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ دیا جائے گا'۔ چونکہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ گروی مشقت استحصال کا سبب بنتی ہے اور گروی مزدور کو نہ تو اپنی قابلیت کے مطابق کام کرنے کا موقع ملتا ہے اور نہ ہی اسے اپنے کام کے مطابق معاوضہ ملتا ہے، اس کا خاتمہ ایک آئینی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔

گروی مشقت کی آئین کے آرٹیکل 14 (جو فرد کی عزت نفس کی پامالی اور ایذارسانی کی ممانعت کرتا ہے)، آرٹیکل 15 (نقل وحرکت اور رہائش کی آزادی)، اور آرٹیکل 37(ہ) (کام کے منصفانہ اور انسانی حالات کو یقینی بنانے کی ریاستی ذمہ داری) کے تحت ممانعت ہے۔ کسی فرد کو گروی

مشقت کے تحت رکھنے کا مطلب اسے اس کی بنیادی آزادیوں جیسے کہ نقل وحرکت کی آزادی (آرٹیکل 15)، اجتماع کی آزادی (آرٹیکل 16)، انجمن سازی کی آزادی (آرٹیکل 17)، پیشے کی آزادی (آرٹیکل 18)، تقریر کی آزادی (آرٹیکل 19)، اور مساوی شہری ہونے کے حق (آرٹیکل 25) سے محروم کرنا ہے۔ ان آئینی دفعات کا مختلف قوانین وضع کر کے اطلاق کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل قوانین گروی مشقت سے متعلق دفعات کا اطلاق کرتے ہیں:

- گروی مشقت/ جبری مشقت سے متعلق قوانین
- بچوں (مشقت کو گروی رکھنا) کا ایکٹ، 1933
- بانڈڈ لیبر سسٹم (خاتمہ) ایکٹ، 1992ء (جس کا اطلاق دارالحکومت اسلام آباد کے علاقوں اور بلوچستان پر ہوتا ہے)
- بانڈڈ لیبر سسٹم (خاتمہ) ایکٹ، 1992ء (پنجاب نے 2012ء میں منظور کیا)
- خیبر پختونخوا بانڈڈ لیبر سسٹم (خاتمہ) ایکٹ، 2015
- سندھ بانڈڈ لیبر سسٹم (خاتمہ) ایکٹ، 2015ء
- پنجاب بھٹوں پر بچوں کی مشقت کے خاتمے کا ایکٹ، 2016ء
- انسانی سمگلنگ کی ممانعت اور روک تھام کا آرڈیننس، 2002ء
- پنجاب مزارعت ایکٹ، 1887ء
- سندھ مزارعت ایکٹ، 1950ء
- این ڈبلیو ایف پی مزارعت ایکٹ، 1950ء
- بلوچستان مزارعت آرڈیننس، 1979ء
- ضابطہ تعزیرات پاکستان، 1860ء

بانڈڈ لیبر سسٹم (خاتمہ) ایکٹ، 1992ء گروی مشقت کا خاتمہ کرتا ہے اور ان رواجاتی انتظامات کو ہدف بناتا ہے جو گروی مشقت کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ایسے کسی بھی قرضوں کا بھی خاتمہ کرتا ہے جن کی ادائیگی کے لیے افراد کو مشقت کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ گروی مشقت سے متعلقہ دیگر قوانین میں انسانی سمگلنگ کی ممانعت اور روک تھام کا آرڈیننس، 2002ء (معاشی اور جنسی استحصال پر قابو پانا) اور ضابطہ تعزیرات پاکستان، 1860ء (معاشی اور جنسی استحصال کی روک تھام) شامل ہیں۔

بانڈڈ لیبر سسٹم (خاتمہ) ایکٹ ملک میں گروی مشقت کے خاتمے کا بندوبست کرتا ہے۔ گروی مشقت کی سرگرمی اس ایکٹ کے نفاذ کے بعد ایک قابل سزا جرم ہے (جس کی سزا کم از کم 2 سال اور زیادہ سے زیادہ 5 سال، اور کم از کم پچاس ہزار روپے جرمانہ، یا دونوں سزائیں ہوں گی)۔ ایسی ہی دفعات خیبر پختونخوا اور سندھ کے نئے وضع کیے گئے قوانین میں بھی موجود ہیں۔ قانون کے نفاذ کا جائزہ لینے اور آزاد کرائے گئے گروی مزدوروں کی بحالی میں مدد کے لیے ضلعی سطح پر نگران کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں۔

> بانڈڈ لیبر سسٹم (خاتمہ) ایکٹ، **1992**ء گروی مشقت کا خاتمہ کرتا ہے اور ان رواجاتی انتظامات کو ہدف بناتا ہے جو گروی مشقت کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ایسے کسی بھی قرضوں کا بھی خاتمہ کرتا ہے جن کی ادائیگی کے لیے افراد کو مشقت کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ گروی مشقت سے متعلقہ دیگر قوانین میں انسانی سمگلنگ کی ممانعت اور روک تھام کا آرڈیننس، **2002**ء (معاشی اور جنسی استحصال پر قابو پانا) اور ضابطہ تعزیرات پاکستان، **1860**ء (معاشی اور جنسی استحصال کی روک تھام) شامل ہیں۔

انسانی سمگلنگ کی روک تھام اور قابو پانے کے آرڈیننس 2002ء کے مطابق، اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے ہوئے کسی بھی فائدے کے حصول کی خاطر یا استحصالی تفریح، غلامی یا جبری مشقت کے مقصد کی خاطر پاکستان کے اندر اور باہر انسانی سمگلنگ کی منصوبہ بندی کرتا ہے یا اس میں ملوث پایا جاتا ہے، یا اس مقصد کے لیے پاکستان کے اندر یا باہر بچوں کو گود لیتا ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ سات سال قید اور جرمانے کی سزا کا مستوجب ہوگا۔

ضابطہ تعزیرات پاکستان میں بھی جبری یا گروی مشقت سے متعلق دفعات موجود ہیں۔ ضابطہ تعزیرات کا سیکشن 370 کسی بھی فرد کو بطور غلام خریدنے یا فروخت کرنے کی ممانعت کرتا ہے۔ کوئی بھی شخص جو کسی بھی شخص کو درآمد کرتا ہے، برآمد کرتا ہے، خریدتا ہے، بیچتا ہے، یا کسی کے حوالے کرتا ہے، یا کسی کو بطور غلام اپنی تحویل میں لیتا ہے یا قید کرتا ہے، وہ سات سال قید اور جرمانے کا مستوجب ہوگا۔ ضابطہ تعزیرات کا سیکشن 371 ایسے کسی بھی فرد کے لیے 10 سال قید اور جرمانے کی سزا تجویز کرتا ہے جو معمولاً غلاموں کا بیوپار (پیشے کے طور پر) کرتا ہو۔ ضابطہ تعزیرات کے سیکشن 374 کے مطابق، کوئی بھی شخص جو کسی فرد کو اس کی مرضی کے خلاف لازمی مشقت (جبری مشقت) پر مجبور کرے، وہ پانچ سال قید، یا جرمانے یا دونوں سزاؤں کا مستوجب ہوگا۔

معاہدوں کی دفعات اور سفارشات پر عمل درآمد کے لیے صوبائی سطح پر اداراتی فریم ورک موجود ہے۔ اس حوالے سے لیبر سے متعلق صوبائی محکمے، صوبائی پولیس اور داخلی محکمے، اور وزارت داخلہ (وفاقی سطح پر) اور اس سے منسلک شعبے بشمول وفاقی تحقیقاتی ایجنسی (ایف آئی اے) بھی موجود ہے۔

ملازمتیں تبدیل کرنے کی آزادی اور چھوڑنے کا حق: آئین پاکستان کے آرٹیکل 18 کے مطابق، 'ہر شخص کو کوئی جائز پیشہ یا مشغلہ اختیار کرنے اور کوئی جائز کاروبار یا تجارت کرنے کا حق ہوگا'۔ چنانچہ، محنت کش جب چاہیں، ضروری طریقہ کار کو پورا کرنے کے بعد، اپنا پیشہ چننے اور ملازمت چھوڑنے میں آزاد ہیں۔ محنت کشوں کو اپنے مالکان کو پیشگی نوٹس دینے کے بعد ملازمت تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ (ایس او۔12 بابت سٹینڈنگ آرڈرز آرڈیننس، 1968)۔ ایسی ہی دفعات خیبر پختونخوا اور سندھ کے متعلقہ قوانین میں بھی موجود ہیں۔

غیر انسانی کام کے حالات: پاکستان میں کام کا عام دورانیہ 48 گھنٹے فی ہفتہ ہے۔ اوورٹائم کے اوقات 24 گھنٹے فی ہفتہ (خیبر پختونخوا)، 12 گھنٹے فی ہفتہ/ 624 گھنٹے سالانہ (بلوچستان، دارالحکومت اسلام آباد، اور پنجاب)، اور سالانہ 150 گھنٹے (سندھ) ہیں۔ زیادہ تر صورتوں میں، اوورٹائم سمیت کام کے اوقات 56 گھنٹے فی ہفتہ سے زائد ہیں۔

ماحصل

انیسویں صدی میں غلامی پر پابندی کے باوجود یہ عمل آج کے دور میں جاری وساری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق، گذشتہ صدیوں میں بحر اوقیانوس پار غلاموں کی تجارت کی بھینٹ چڑھنے والے لوگوں کی تعداد کے مقابلے میں ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو آج کے دور میں اس برائی کا نشانہ بن رہے ہیں۔ جدید غلامی دنیا بھر میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے، اور کئی حکومتیں نیز عالمی وعلاقائی تنظیمیں اس کی روک تھام کے لیے کوشاں ہیں اور اس کے خلاف جدوجہد کر رہی ہیں۔

اگرچہ پاکستان کے قوانین کی رو سے جدید غلامی ایک جرم ہے چاہے یہ کسی بھی شکل میں ہو، مگر اس حوالے سے، بہت ہی کم اعداد وشمار ہیں کہ کتنی تحقیقات شروع ہوئیں، کتنی خلاف ورزیوں کا سراغ لگایا گیا، کتنے ملزموں کے خلاف قانونی کاروائی ہوئی اور سزا کتنے لوگوں کو ہوئی۔ حقیقی مسئلہ اس وقت تک موجود رہے گا اور حل نہیں ہوگا جب تک قومی سطح پر تحقیق کرنے اور کوائف اکٹھا کرنے کا کام وسیع اور ٹھوس بنیادوں پر نہیں کیا جاتا۔ جدید غلامی کی مختلف شکلوں کے خلاف مختلف شعبے کام کر رہے ہیں۔ جبری۔ گروی مشقت کی برائی سے نبٹنے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف محکمے متعلقہ کوائف اور معلومات کا آپس میں تبادلہ کریں۔

شادی کی عمر کے معاملے پر بحث

آئی۔اے۔رحمان

شادی کے لیے لڑکیوں کی عمر کم سے کم کتنی ہونی چاہیے؟ اس نئی بحث نے ہمارے معاشرے کی سماجی سوچ میں موجود رجعت پسندی کو آشکار کیا ہے، اور اس کے مضمرات حقیقتاً قابلِ تشویش ہیں۔

90 برس قبل ہندوستان کی سینٹرل اسمبلی میں ایک ہندو رکن اسمبلی نے اپنی برادری کی لڑکیوں کی شادی کے لیے کم سے کم عمر کی حد مقرر کروانے کے لیے بل پیش کیا، تاکہ بچپن کی شادی جیسی سماجی لعنت کو ختم جا سکے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے زور دیا کہ اس مجوزہ اقدام کے تحفظ میں مسلمان لڑکیوں کو بھی لیا جائے۔ کئی مسلمان اراکین نے ان کی مخالفت کی، لیکن دیگر مذہبی برادری سے تعلق رکھنے والے کسی رکن نے انہیں اپنا مؤقف سامنے رکھنے کے حق کو چیلنج نہیں کیا۔

حال ہی میں حکمران جماعت کے غیر مسلم رکن اسمبلی رمیش وانکوانی نے لڑکیوں کے لیے شادی کی عمر کی حد کم سے حد 18 برس تک بڑھانے کا بل پیش کیا۔ ایک مسلم وزیر نے نہ صرف ان کی مخالفت کی بلکہ انہیں بل پیش کرنے کے ان کے حق پر بھی سوال کھڑا کر دیا، یوں وزیر نے اپنے عمل سے یہ ظاہر کر دیا کہ وانکوانی کو اس کے مذہبی عقیدے کی وجہ سے کسی ایسے مسئلے کو اٹھانے کی اجازت نہیں ہے جس کا اثر مسلمان لڑکیوں پر ہوتا ہو۔ ہماری قانون سازی کی تاریخ میں، نہ آزادی سے قبل نہ آزادی کے بعد، اس قسم کی رجعت پسندانہ سوچ کا ایسا مظہر کبھی دیکھنے کو نہیں ملا ہے۔

قائداعظم نے انڈیا کی سینٹرل اسمبلی میں شادی قوانین پر دو بار اظہار رائے پیش کیا۔ پہلے موقع پر انہوں نے اس ہندو میرج بل کی حمایت کی جس میں بین الذات شادیوں کی اجازت دی گئی تھی اور انہوں نے یہ واضح کیا کہ 'میں ہندو اقلیت کی آگے بڑھ کر مدد کرنے میں اتنی ہی دلچسپی رکھتا ہوں۔ جتنی دلچسپی کوئی بھی شخص مسلمان اقلیت کی آگے بڑھ کر مدد کرنے میں رکھتا، اگر وہ (مسلمان اقلیت) تکلیف میں مبتلا ہوتی'۔

دوسرے موقع پر انہوں نے ہندو برادری میں بچپن کی شادی کی روک تھام کے لیے پیش کیے جانے والے بل پر مباحثہ کے دوران اپنا موقف بیان کیا۔

چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ 1929ء، جس کا اطلاق مسلمان لڑکیوں پر بھی ہوتا ہے، کی تیاری میں قائد کی کامیابی کا حوالہ بھی بار بار عوامی مباحثے میں دیا جاتا رہا ہے، مگر اس کی یاد میں ایک بار پھر یہاں تازہ کرنا سودمند رہے گا۔

علماء کی ایک بڑی تعداد نے قائد کی اس پیش قدمی کی مخالفت کی، ایسے میں مولانا شبلی نعمانی واحد ایسے شخص تھے جو ان کی حمایت میں آگے آگے تھے۔ جب ان سے اسمبلی میں اپنی نشست سے استعفیٰ دینے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے واضح کیا کہ انہیں نشست سے دستبردار کرنے کا حق صرف بمبئی کے مسلمانوں کو حاصل ہے جنہوں نے انہیں منتخب کیا تھا۔

سرداہل (یہ نام بل پیش کرنے والے رکن اسمبلی کے نام پر رکھا گیا تھا) پر مباحثے کے دوران انہوں نے مندرجہ ذیل نکات پیش کیے:

☆ بچپن کی شادی ایک سماجی لعنت تھی اور وہ مسلمانوں میں پھیلے اس رواج کے بارے میں جان کر خوفزدہ ہو گئے تھے۔

☆ قانون کی پریکٹس کے اپنے 30 سالہ تجربے میں انہوں نے یہ بات جان لی تھی کہ شادی ایک خالص اور سادہ سماجی معاہدہ ہے اور اس کا مذہب سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔

☆ ایسا کوئی اسلامی تحریری حوالہ موجود نہیں جس میں مسلمانوں کو 14 برس کی عمر تک پہنچنے سے قبل اپنی بیٹیوں کی شادی کرانا لازمی قرار دیا گیا ہو۔

> دلہن بننے والی چھوٹی بچی اکثر و بیشتر ازدواجی ریپ کا نشانہ بنتی ہے۔ ابھی وہ تولیدی عوامل کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے قابل بھی نہیں ہوتی کہ اسے ان عوامل سے زبردستی گزارا جاتا ہے۔

چونکہ بل کی مخالفت کٹر ہندوؤں نے بھی کی تھی، اس لیے اسمبلی میں موجود مختلف ہندو اور مسلمانوں اراکین کی جانب سے بل کی حمایت میں آگے آنے کے عمل کو قائداعظم نے اتحاد کی علامت کے طور پر خوش آئند قرار دیا جو کہ بدیسی حکومت سے آزادی پانے کے لیے ضروری تھا۔

تاہم آج کے پاکستان میں حکام قائد کو زیادہ سے زیادہ غیر متعلقہ کرنے کے لیے پرعزم دکھائی دیتے ہیں۔ ضیاالحق نے قائد کی قومی عظمت اور مرتبے کو جو ٹھیس پہنچائی اس کا مداوا ضیا کے بعد آنے والی کسی حکومت نے نہیں کیا۔ مگر بچپن کی شادی کی چھوٹ کے معاملے پر قائد کے خیالات کو یاد کرتے ہوئے کسی کو خفا کیے بغیر سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔

پوری دنیا اس بات سے آگاہ ہے کہ بچپن کی شادی کس قدر شیطانی عمل ہے۔ پاکستان اس سے بدترین حد تک متاثرہ ممالک میں سے ایک ہے۔ ایک میڈیا رپورٹ کے مطابق، 21 فیصد لڑکیوں کی شادی 18 برس کی عمر تک پہنچنے سے قبل اور 3 فیصد لڑکیوں کی شادی 15 برس کی عمر تک پہنچنے سے قبل ہی کروادی جاتی ہے۔ یہ برائی معاشروں میں جوتا ہی پھیلاتی ہے وہ اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

دلہن بننے والی چھوٹی بچی اکثر و بیشتر ازدواجی ریپ کا نشانہ بنتی ہے۔ ابھی وہ تولیدی عوامل کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے قابل بھی نہیں ہوتی کہ اسے ان عوامل سے زبردستی گزارا جاتا ہے۔ اس سے پہلے وہ یہ سیکھے اور جان پائے کہ بطور ماں اس پر کون کون سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، وہ ایک ماں بن جاتی ہے۔

بار بار بچے کی پیدائش ماؤں کی شرح اموات میں اضافے اور ایسے بچوں کی پیدائش کا باعث بنتی ہے جو اس قدر کمزور ہوتے ہیں کہ ان کا زندہ بچنا مشکل ہو جاتا ہے، جس کی مثال ہم تھر کی صورتحال سے حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جہاں ایک طرف بچپن کی شادی خواتین کی زندگیوں کے ضیاع کا باعث بنتی ہے وہیں دوسری طرف نومولود بچوں کی شرح اموات میں اضافے اور ناپختہ بچوں کی پیدائش کا باعث بنتی ہے۔ یہ دونوں ایسے زبردست نقصان کا باعث بنتے ہیں جسے کوئی بھی ملک برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

کئی ممالک خواتین اور بچوں کے معیار زندگی بہتر کر چکے ہیں اور خاندانوں کو لڑکیوں کی شادی کی عمر تک پرورش کرنے کے قابل بنا کر اپنی اقتصادی ترقی کی شرح میں بہتری لا چکے ہیں۔ اس کی سب سے قریبی مثال بنگلہ دیش ہے۔ ترکی، مصر، بنگلہ دیش، اور متحدہ عرب امارات سمیت متعدد مسلم ممالک نے لڑکیوں کے لیے شادی کی کم سے کم عمر 18 برس مقرر کی ہوئی ہے۔ پاکستانی علماء ان ممالک میں مذہبی احکامات کی تشریح کو کس طرح دیکھتے ہیں؟ کچھ عرصہ قبل سندھ نے لڑکیوں کے لیے شادی کی عمر بڑھا کر 18 برس مقرر کی تھی، تو کیا صوبے پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے؟

آخری بات یہ کہ، لڑکیوں کے لیے شادی کی کم سے کم عمر مقرر کرنے کا عمل کوئی نئی 'سازش' نہیں ہے۔ چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ 1929ء آزادی کے 72 برسوں تک نافذالعمل رہتا آیا ہے۔ مسلم فیملی لاء آرڈیننس میں لڑکیوں کی شادی لائق عمر کی قانونی شرط 2 دہائیوں تک درج رہی، جس کے بعد جنرل ضیا نے اپنی مرضی سے اس کا خاتمہ کر دیا۔

موجودہ صورتحال میں پی ٹی آئی رہنماؤں کی جانب سے اپنے حد سے زیادہ رجعت پسند بازو کی حمایت سے انکار کا فیصلہ روشنی کی ایک کرن سے کم نہیں ہے۔ حکمران جماعت کے پاس اس مسئلے پر کسی اتفاقِ رائے کو نظرانداز کرتے رہنے کا زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہر ایک کی خواہش یہی ہوگی کہ وہ اپنے چند گمراہ اراکین کے اذہان کو غلط خیالات سے چھٹکارہ دلانے میں کامیاب ہوں گے۔

لیکن اگر وہ اس مسئلے پر یونہی گھبراہٹ کا شکار رہتے ہیں تو یوں اس تاثر کو مزید تقویت پہنچے گی کہ موجودہ حکومت نے جہل پسند عناصر کے لیے راہیں ہموار کرنے میں گزشتہ حکومتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے، جو کہ ملک کی خواتین اور اقلیتی برادریوں کے افراد کے لیے ناقابلِ بیان دشواریوں اور صعوبتوں کا باعث بنے گا اور اس کے علاوہ رجعت پسندی کو مضبوط کرنے کی وجہ بنے گا۔

(انگریزی سے ترجمہ، بشکریہ ڈان اردو)

انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے کے 70 سال

تیسرے مرحلہ وار جائزے کے حوالے سے پاکستان کی کارکردگی

آئی۔اے۔رحمان
اعزازی ترجمان، ایچ آر سی پی
9 دسمبر، 2018ء

سب سے پہلے میں آپ سب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اتوار کی صبح تشریف لائے۔

میں اس بات کو دہرانا چاہوں گا کہ انسانی حقوق کے ساتھ ہمارا رشتہ دیگر اقوام سے زیادہ گہرا ہے۔ آپ میں سے بہت سے اس بات سے واقف ہوں گے کہ کیسے، آزادی کے لیے ہماری جدوجہد کے دوران، برطانوی ہندوستانیوں کو کہا کرتے تھے کہ چونکہ وہ مؤخر الذکر کی تجویز (آئینی اصلاحات سے متعلق) ماننے کو تیار نہیں تھے اس لیے انہیں اپنا آئین بنانا چاہیے۔

اور یوں، ایک کمیٹی قائم کی گئی تاکہ اس بات کا تعین کیا جاسکے کہ ہندوستانی کس قسم کا آئین چاہتے تھے۔ اس کمیٹی کو پاکستان میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا کیونکہ اس کا نام نہرو کمیٹی تھا۔ اس کے صدر جواہر لعل نہرو کے والد موتی لعل نہرو تھے۔ نہرو کمیٹی مسلم لیگ کے اس مطالبے سے متفق نہیں تھی کہ مرکزی حکومت اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی 33 فیصد نمائندگی ہونی چاہیے؛ وہ ہمیں صرف 30 فیصد دینا چاہتے تھے۔ چونکہ وہ اس مطالبے سے اتفاق نہیں کرتے تھے چنانچہ مسلم لیگ نے نہرو رپورٹ کے زیادہ تر حصے کو مسترد کردیا۔

تاہم، میں آپ کو یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کہ رپورٹ یا آئین—جو نہ صرف کانگریس کے اراکین نے بلکہ دیگر لوگوں نے بھی لکھا تھا، جیسے کہ مسلمانوں کی طرف سے شعیب قریشی— میں بنیادی حقوق سے متعلق ایک باب بھی شامل تھا جس میں اظہار رائے، انجمن سازی، اجتماع، قومیت، نقل و حرکت کی آزادی شامل تھی۔ پس، انسانی حقوق اس وقت ہماری جدوجہد آزادی سے متعلق بحث کا بھی حصہ تھے۔

'ہماری 70 سالہ تاریخ میں، ہمارا بنیادی حقوق کے ساتھ رشتہ دیگر ممالک سے زیادہ گہرا ہے۔'

اگرچہ برصغیر ایک نوآبادی تھی، یہ لیگ آف نیشنز کا بھی رکن تھا۔ اس کی رکنیت کی بدولت، جب اقوام متحدہ قائم ہوئی تو برصغیر کا ایک نمائندہ اس عمل کا حصہ تھا۔ یہ نمائندہ، اتفاقاً، چودھری ظفراللہ خان تھے جو پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ بنے۔ 10 دسمبر 1948ء کو جب انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ منظور ہوا تو ظفراللہ خان بھی وہاں موجود تھے اور پاکستان نے یوڈی ایچ آر کی منظوری کی حمایت کی۔ پاکستان سمیت صرف 48 ممالک نے ایسا کیا تھا۔

> پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال کا درست ترین اور مفصل تجزیہ عالمگیر مرحلہ وار جائزے (یو پی آر) نے کیا ہے۔

جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو جو پہلا کام کیا گیا وہ دو کمیٹیوں کا قیام تھا۔ پہلی کمیٹی آئین کے بنیادی اصولوں کے لیے تھی۔ پھر جناح نے ایک اور کمیٹی قائم کرنے کا حکم دیا جو بنیادی حقوق اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق تھی۔ انہوں نے دوسری کمیٹی کی صدارت خود کی۔ ان کی زندگی کے دوران، بڑی تعداد میں قوانین منظور کیے گئے، اور اکتوبر 1950ء میں قانون ساز اسمبلی نے بنیادی حقوق سے متعلق باب کی منظوری دی۔ آئین 1956ء تک مکمل نہیں ہوسکا تھا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ہماری 70 سالہ تاریخ میں، ہمارا بنیادی انسانی حقوق کے ساتھ رشتہ دیگر ممالک سے زیادہ گہرا ہے۔ ہمیں (ان حقوق) کا احترام کرنا چاہیے؛ ان سے قطع تعلق کرنا بدقسمتی ہوگی۔

بنیادی حقوق پر (موجودہ) باب ویسا ہی ہے جیسا 1950ء میں تھا؛ اس میں صرف دو یا تین ترامیم کی گئیں۔ مثال کے طور پر، 1950ء کی دستاویز کہتی ہے کہ خواتین کو مساوی کام کی مساوی اجرت ملنی چاہیے، جسے ہم نے 1956ء میں ختم کردیا۔ 1950ء میں ہر قسم کی ایذارسانی پر پابندی عائد کردی گئی؛ اسے بھی 1956ء میں نظرانداز کردیا گیا۔ پھر، 1973ء کے آئین میں، کچھ نکات شامل کیے گئے۔ ان میں سے سب سے اہم اس کا ابتدائیہ تھا۔ ماضی میں، ابتدائیہ کہتا تھا کہ اگرچہ حاکمیت اللہ کی ہے، تاہم یہ منتخب نمائندوں کو امانت کے طور پر سونپی گئی ہے۔ لیکن ہمارے نمائندوں نے کہا کہ قائداعظم کے اقوال کی رہنمائی میں، اس ابتدائیے کو آئین کا حصہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ، انہوں نے خود کو مقتدر اعلیٰ تصور کرلیا اور اس کے 'نمائندے' نہ رہے۔

انسانی حقوق کے حوالے سے انہوں نے چند ترامیم کیں، مثال کے طور پر ایذارسانی کے متعلق۔ اگر ایذارسانی اقبال جرم یا گواہی کے حصول کے لیے کیا جائے تو یہ غیر قانونی ہے—اسے کسی اور وجہ کی بناء پر قبول کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے استحصال کے خاتمے سے متعلق آرٹیکل 3 شامل کیا، اور آرٹیکل 6 بھی شامل کیا جو کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ غداری کا مرتکب ہوگا۔ لیکن بنیادی ڈھانچہ وہی ہے جو 1950ء میں ترتیب دیا گیا تھا۔

پاکستان میں انسانی حقوق کی صورتحال کا درست ترین اور مفصل تجزیہ عالمگیر مرحلہ وار جائزے (یو پی آر) نے کیا ہے۔ پاکستان تین مرحلہ وار جائزوں سے گزر چکا ہے۔ میں تیسرے جائزے کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ ہم میں سے ہر کوئی اس میں اپنا کردار ادا کرسکتا ہے اور کردار ادا کرنے کے لیے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کیا کہتا ہے۔ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے انسانی حقوق نے اپنی کارروائیوں کے دوران مختلف ممالک میں انسانی حقوق کی صورتحال کا جائزہ لیا۔ 2006ء میں، یہ محسوس کیا گیا کہ یہ کمیشن مؤثر طور پر کام کرنے کے قابل نہیں تھا، چونکہ کام کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس کی جگہ انسانی حقوق کونسل (ایچ آر سی) تشکیل دی گئی۔ 18 اراکین پر مشتمل ایچ آر سی دنیا بھر میں انسانی حقوق کی صورتحال کی بہتری اور نگرانی کے لیے کام کرتی ہے۔

اس کی نگرانی کا پہلا طریقہ کار 'خصوصی طریق ہائے کار' کے ذریعے ہے۔ ان طریق ہائے کار کے تحت، نمائندوں کا تقرر مختلف موضوعات یا خطوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ یہ اقوام متحدہ کے خصوصی مندوب کہلاتے ہیں۔ جیسے کہ ایک فلسطین کے لیے ہے، ایک افغانستان کے لیے، وغیرہ وغیرہ۔ اپنی زندگی کے آخری حصے میں، عاصمہ جہانگیر ایران میں مذہبی آزادی سے متعلق خصوصی مندوب کے طور پر خدمات انجام دیتی رہیں۔ ان کا تقرر موضوع اور خطے دونوں کے حوالے سے تھا۔ ایسے بہت سے موضوعات ہیں، مثال کے طور پر دیگر مندوبین کے علاوہ، ایک مندوب اظہار رائے کی آزادی کے لیے ہے اور ایک ججوں اور وکلاء کی آزادی کے لیے۔

'ہم میں سے ہر کوئی عالمگیر مرحلہ وار جائزے میں اپنا کردار ادا کرسکتا ہے۔ اپنا کردار ادا کرنے کے لیے، ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کیا کہتا ہے۔'

یو پی آر کا دوسرا طریقہ کار یہ ہے کہ اس کا انعقاد مختلف ممالک میں ہر چار یا پانچ سال بعد کیا جائے۔ پاکستان کا پہلا یو پی آر 2008ء میں انجام پایا۔ اس جائزے کے بعد،

پاکستان کو اپنی انسانی حقوق کی صورتحال کو بہتر بنانے سے متعلق 51 سفارشات پیش کی گئیں۔ ایک جائزہ 2012ء میں بھی ہوا جس میں 167 سفارشات پیش کی گئیں۔ اس جائزے کے بعد، سول سوسائٹی نے بھی اپنی تجاویز دیں۔ جب یہ جائزہ منعقد ہوتا ہے اور ہر ریاست کے نمائندے موجود ہوتے ہیں، تو تمام حاضر ممالک کو بحث میں حصہ لینے کی اجازت ہوتی ہے۔ معتبر این جی اوز کو بھی اجازت ہوتی ہے کہ وہ جائزہ رپورٹ شائع ہونے کے بعد اپنا کردار ادا کریں یا اس وقت سے ایک سال پہلے اپنی تجاویز اور آراء بھیجیں۔ ان تجاویز اور آراء کو جائزے میں شامل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ، پاکستان کا ہر شہری اپنی تنظیموں کے ذریعے اپنے ملک میں درپیش کسی بھی مسئلے کی نشاندہی کرسکتا ہے۔

اس عمل میں ایک سال کی جدوجہد شامل ہوتی ہے۔ یہ چند دن کی بات نہیں۔ مثال کے طور پر، تیسرے یو پی آر پر فروری 2017ء میں کام شروع ہوا اور فروری 2018ء میں ختم ہوا۔ فروری 2017ء میں، ایچ آر سی نے تین ممالک مصر، عراق اور لیٹویا کا انتخاب کیا تاکہ یہ فیصلہ کرنے میں حکومت پاکستان کی مدد کی جاسکے کہ یو پی آر پر کیسے عملدرآمد کرنا ہے۔

اس کے بعد، حکومت پاکستان نے ملک کے حالات و واقعات اور 2012ء کے یو پی آر کی سفارشات پر عمل درآمد سے متعلق ملک کی پیش رفت پر ایک ملکی رپورٹ جمع کرائی۔ اس کے بعد، ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کے دفتر نے اپنے آزادانہ نقطہ نظر سے ایک ورکنگ پیپر تیار کیا۔ اس ورکنگ پیپر کا خلاصہ کیا گیا اور اسے حکومت پاکستان کو بھیجا گیا۔ پھر، 14 ممالک نے اپنے سوالات پاکستان کو بھیجے اور ہم سے کہا کہ جائزے کے انعقاد کے لیے ان کے جوابات تیار کریں۔ یہ یو پی آر 13 نومبر 2017ء کو ہوا اور اس میں انسانی حقوق کی صورتحال میں کوئی بہتری نہیں دیکھی گئی۔

میں کچھ نکات کا ذکر کرنا چاہوں گا جو حکومت پاکستان نے اپنی ملکی رپورٹ میں پیش کیے تھے۔ پہلی بات جو وزیر خارجہ نے کہی وہ یہ تھی کہ جو رپورٹ وہ پیش کررہے تھے وہ 'ایک وسیع اور جامع عمل کے بعد تیار کی گئی تھی جس میں سول سوسائٹی کی تنظیموں اور تعلیمی اداروں اور ماہرین تعلیم سمیت تمام متعلقہ شراکت دار شامل تھے۔' اقوام متحدہ ہمیشہ سے کہتا رہا ہے کہ جو رپورٹ جمع کرائی جاتی ہے وہ ملک کے عوام کی مشاورت سے تیار کی جانی چاہئے نہ کہ صرف حکومت کی طرف سے — اور یہ کہ اس رپورٹ کے علاوہ اقوام متحدہ میں اس حوالے سے ہونے والی کارروائیوں کو بھی عام کیا جانا چاہئے۔ ہمارے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ حکومت پاکستان اپنی رپورٹ کی تیاری کے حوالے سے نہ تو ہم سے مشورہ کرتی ہے اور نہ ہی وفد کی واپسی کے بعد جائزے کی کارروائیوں اور ان وعدوں سے آگاہ کرتی ہے جو اس نے ہمارے ایماء پر کیے ہوتے ہیں۔ مجھے اس دعوے پر یقین کرنا انتہائی مشکل ہے کہ سول سوسائٹی یا شعبہ تعلیم کے کسی بھی رکن سے مشورہ کیا گیا تھا۔

> یو پی آر پر فروری **2017**ء میں کام شروع ہوا اور فروری **2018**ء میں ختم ہوا۔ فروری **2017**ء میں، ایچ آر سی نے تین ممالک مصر، عراق اور لیٹویا کا انتخاب کیا۔

وزیر خارجہ نے یہ بھی کہا کہ، ' گزشتہ چار سالوں میں، پاکستان میں جمہوریت پروان چڑھی ہے، اور ملک میں ایک منتخب اور آزاد پارلیمنٹ، آزاد عدلیہ، آزاد میڈیا اور ایک سرگرم سول سوسائٹی موجود ہے۔ جب یہ رپورٹ پیش کی جارہی تھی تو اس وقت میڈیا کا گلا گھونٹا جارہا تھا اور سول سوسائٹی سرگرم ہونا تو دور کی بات ہے، اپنی زندگی کے لیے جدوجہد کررہی تھی۔ پھر وفد نے ان اقدامات کا ذکر کیا جو پاکستان نے اٹھائے تھے اور کہا کہ اگرچہ (ریاست) تمام انسانی حقوق کو تسلیم کرتی ہے، تاہم معاشی، سماجی اور ثقافتی حقوق زیادہ اہم ہیں۔ درحقیقت، یہ حقوق اتنے 'اہم' ہیں کہ وہ ہمارے بنیادی حقوق میں بھی شامل نہیں ہیں۔ اگر انہیں کہیں شامل کیا گیا ہے تو (آئین کے) پالیسی اصولوں میں۔ کام کا کوئی حق نہیں، صحت کا کوئی حق نہیں، ثقافت کا کوئی حق نہیں، سماجی تحفظ کا کوئی حق نہیں۔ یہ معاشی حقوق پالیسی اصولوں میں تو موجود ہیں لیکن (وفد) نے جو دعویٰ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہمارے لیے شہری اور سیاسی حقوق سے زیادہ اہم ہیں۔

'پاکستان کو پہلے جائزے میں 51 سفارشات موصول ہوئیں۔ دوسرے جائزے میں اسے 167 سفارشات موصول ہوئیں۔ تیسرے جائزے میں اسے 289 سفارشات موصول ہوئیں۔'

پاکستان کے نمائندوں نے مزید کہا کہ ہمیں کئی محاذوں پر لڑنا پڑا تھا، جیسے کہ دہشت گردی کے خلاف، خاص طور پر (پشاور میں) آرمی پبلک اسکول پر حملے کے بعد، اور یہ کہ عوام کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے تحت حکومت نے سزائے موت سے پابندی ہٹائی۔ نمائندوں نے یہ بھی کہا کہ 'تاریخ کی ایک ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ سرد جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عالمی مسائل اور غیر ملکی طاقتوں کے درمیان نظریاتی مسابقت کے اثرات پاکستان پر پڑے تھے۔'

جب یو پی آر پر بحث شروع ہوئی تو پاکستانی وفد کا تاثر یہ تھا کہ ہر کوئی ان کے خلاف ہے۔ ہر کوئی ہمارے خلاف نہیں۔ اس (تیسرے یو پی ار) کی رپورٹ میں 154 پیراگراف ایسے ہیں جن میں دیگر ممالک کے نمائندوں کا کہنا ہے کہ وہ چند معاملات پر پاکستان کی پیش رفت کو سراہتے ہیں۔ سوڈان نے کہا کہ پاکستان کی جانب سے منظور کیا گیا موسمی تبدیلی ایکٹ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ سوئٹزرلینڈ نے کہا کہ، 'ہم ضابطہ تعزیرات میں غیرت کے نام پر قتل کے حوالے سے کی گئی ترمیم کا خیر مقدم کرتے ہیں۔' یو اے ای نے تمام صوبوں میں قومی مرکز برائے معمر افراد کے قیام کی تعریف کی۔ اس کے باوجود ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے! ارجنٹینا نے بچوں کے حقوق کے معاہدے کے اختیاری پروٹوکول کی منظوری کو سراہا۔ یہ معاہدہ مسلح تنازعات میں بچوں کی شمولیت سے متعلق ہے۔ ہم نے اس پر بعد میں عمل درآمد کیا۔ پس، 154 پیراگراف میں ہماری تعریف کی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایسا کوئی نہیں تھا جو پاکستان کے 'خلاف' ہو۔

پاکستانی وفد یہ کہتا رہا کہ 'پاکستان نے عدم رواداری اور نفرت انگیز تقریر کے خلاف عالمی جدوجہد کی قیادت کی ہے۔ وزارت مذہبی امور و بین العقائد ہم آہنگی (یہاں ہم اس کا پورا نام نہیں لیتے، ہم اسے محض وزارت مذہبی امور کہتے ہیں) قومی بین العقائد ہم آہنگی کے حوالے سے ایک پالیسی بنا رہی ہے تاکہ اقلیتوں کی سیاسی شرکت کو یقینی بنایا جاسکے۔ مسیحیوں، ہندوؤں، بدھ مت اور کیلاش برادریوں کے تہوار سرکاری طور پر منائے گئے۔' اس تمام گفتگو کے بعد، جس میں پاکستان نے کہا کہ اس نے وہ سب کچھ کیا جو وہ کرسکتا تھا، جائزے میں 289 سفارشات پیش کی گئیں۔ 2008ء میں 51، 2012ء میں 167 اور 2018ء میں 289 سفارشات پیش کی گئیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلی 30 سفارشات ہم سے سادہ سا تقاضا کرتی ہیں کہ ہم مختلف بین الاقوامی معاہدوں کی توثیق کریں۔ مثال کے طور پر، پاکستان نے عالمی معاہدہ برائے شہری و سیاسی حقوق، نیز اس کے دو اختیاری پروٹوکول کی توثیق کر رکھی ہے۔ ہم نے عالمی معاہدہ برائے معاشی، سماجی و ثقافتی حقوق اور اس کے اختیاری پروٹوکولز، اور بچوں کے حقوق کے معاہدے اور اس کے دو پروٹوکولز کی بھی توثیق کر رکھی ہے۔ ان میں سے ایک کا تعلق بچوں کو فروخت، جسم فروشی اور فحش نگاری سے تحفظ فراہم کرنے سے ہے۔ دوسرے اختیاری پروٹوکول کا مقصد بچوں کو مسلح تنازعات میں استعمال ہونے سے بچانا ہے۔

جب یو پی آر کی سفارشات پیش کی جارہی تھیں، تو کچھ

سفارشات ایسی تھیں جنہیں پاکستان نے فوراً قبول کرلیا یا ان کی 'حمایت' کی اور دیگر کو ہم نے 'نوٹ' کرلیا تاکہ ان پر بعد میں فیصلہ کیا جاسکے کہ انہیں قبول کرنا ہے یا نہیں۔ کچھ سفارشات ایسی بھی تھیں جنہیں ہم نے قبول نہیں کیا، باوجود اس کے کہ اقوام متحدہ کی اسکیم کے تحت، عدم قبولیت کی کوئی شق موجود نہیں ہے۔ آپ کسی سفارش کو مسترد نہیں کر سکتے۔ آپ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'ہم اس سفارش کی حمایت نہیں کرتے'۔ 289 سفارشات میں سے ہم نے چار کو 'مسترد' کیا۔ ہم نے 117 کو 'نوٹ' کیا، یہ کہتے ہوئے کہ ہم ان پر غور وخوض کریں گے۔ اور 168 سفارشات کے حوالے سے ہم نے کہا کہ ہم ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان پر عملدرآمد کریں گے۔

'12 ممالک نے ہمیں جبری گمشدگیوں کے خلاف معاہدے پر دستخط کرنے کو کہا ہے اور اس کے باوجود یہ ان 168 سفارشات میں شامل نہیں ہے جو ہم نے قبول کی ہیں۔ اسے صرف 'نوٹ' کیا گیا ہے۔

کیا وجہ ہے کہ ان 117 سفارشات کو صرف 'نوٹ' کیا گیا؟ ہم انہیں قبول کیوں نہیں کرتے؟ پہلی 30 ان معاہدوں سے متعلق ہیں جن کی توثیق کرنے کی ضرورت ہے۔ اب، یہ بہت ہی انوکھا کام ہے۔ 12 ممالک نے سفارش کی ہے کہ پاکستان کو تمام افراد کے جبری گمشدگیوں سے تحفظ کے عالمی معاہدے پر دستخط کرنے چاہئیں۔ آپ سب جانتے ہیں کہ یہ ہماری شہرت پر کتنا بڑا داغ ہے۔ ایسے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ ہیں جو شدید پریشانی میں مبتلا ہیں کیونکہ ان کا باپ، بھائی، بیٹا لاپتا ہے۔ اگر آپ ان تمام لوگوں (جن کے رشتے دار لاپتا ہیں) کے بارے میں سوچیں تو یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ لوگوں کو جبری گمشدگیوں سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے ایک معاہدہ موجود ہے۔ ہم اس پر دستخط کیوں نہیں کرتے؟ 12 ممالک نے ہمیں اس پر دستخط کرنے کو کہا ہے اور اس کے باوجود یہ سفارش ان 168 سفارشات کا حصہ نہیں ہے جنہیں ہم نے قبول کیا ہے۔ اسے صرف 'نوٹ' کیا گیا ہے۔ پھر، 10 یا 12 ممالک نے ہمیں سزائے موت کا خاتمہ کرنے اور عالمی معاہدہ برائے شہری و سیاسی حقوق کے اختیاری پروٹوکول کی توثیق کرنے کو کہا ہے۔

میں اسے 'انوکھا کام' اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ ان 30 سفارشات میں سے ہم نے صرف ایک کی حمایت کی ہے۔ یہ اچھی سفارش ہے کہ: خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمے کا معاہدہ کی توثیق۔ یہ سفارش سینگال اور ہونڈورس نے پیش کی تھی۔ یوگینڈا نے تجویز کیا کہ ہم 'خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیاز سے متعلق معاہدے کے اختیاری پروٹوکول کی توثیق کریں اور خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمے کے عزم کو جاری رکھیں'۔ اب، کیا ان تینوں ممالک کی تجویز میں کوئی فرق ہے؟ نہیں۔ لیکن ہم نے صرف پہلی سفارش کی حمایت کی۔

ہم نے جن سفارشات کی حمایت کی ہے، ان میں سے 15 اس کے سوا اور کچھ نہیں کہتی کہ انسانی حقوق کے موجودہ اداروں کو مستحکم کیا جائے۔ مثال کے طور پر، زمبابوے نے کہا کہ پاکستان کو 'انسانی حقوق کے بین الاقوامی معاہدوں، جن کا یہ فریق ہے، کی دفعات کو ملکی قوانین کا حصہ بنانا چاہئے' یعنی، اسے ان اداروں کو مستحکم کرنا چاہئے جو ان معاہدوں پر عملدرآمد کے لیے موجود ہیں جن پر پاکستان نے دستخط کر رکھے ہیں۔ ترکی، لیبیا، نائجیریا، سوڈان اور فلسطین نے بھی ایسی ہی آراء کا اظہار کیا۔ فلسطین نے کہا کہ پاکستان کو 'انسانی حقوق کے معیارات کے مطابق، وزارت انسانی حقوق اور قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کے کردار اور مؤثر پن کو مستحکم کرنا چاہئے'۔ اسے تسلیم کرلیا گیا۔ ایک اور سفارش (گوئٹے مالا) یہ تھی کہ قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کو پیرس اصولوں کے مطابق مستحکم کیا جائے۔ ایک اور نے کہا کہ قومی کمیشن برائے حقوق نسواں کو مستحکم کیا جائے۔ اور 'مستحکم' کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کمیشنوں کو مزید فنڈز اور مزید عملہ دیا جائے تاکہ وہ اپنی ذمہ داریاں مؤثر طور پر انجام دے سکیں۔

اس کے باوجود، ہماری قومی رپورٹ میں ہم نے کہا کہ ہم نے ایسے ادارے قائم کر رکھی ہیں اور انہیں خاطر خواہ فنڈز دیے جاتے ہیں۔ ہم نے دعویٰ کیا کہ ہم نے خاطر خواہ عملے، خاطر خواہ فنڈز کے حامل ادارے قائم کر رکھے ہیں، لیکن لاتعداد ممالک بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ان اداروں کو زیادہ فنڈز دینے ہوں گے اور ان کے انسانی وسائل میں اضافہ کرنا ہوگا۔ فلپائن نے کہا کہ ہمیں 'معاملے کی اہمیت کے پیش نظر، اضافی فنڈنگ اور اضافی معاونت کے ذریعے خواتین کے حقوق سے متعلق قومی اور صوبائی کمیشنوں کو مستحکم کرنا ہوگا'۔ سری لنکا نے کہا کہ چونکہ پاکستان نے انسانی حقوق پر عملدرآمد کے لیے ایک قومی ایکشن پلان تیار کر رکھا ہے، اسے 'شراکت داروں کے ساتھ مشاورت سے' اسے 'حتمی شکل' دینی چاہئے۔ یو اے ای اور پرتگال نے بھی ایسا ہی کہا۔

ویتنام نے کہا کہ ہمیں 'انسانی حقوق کی تعلیم و تربیت اور آگہی میں اضافے سے متعلق 'اپنے اقدامات' کو مستحکم کرتے رہنا' چاہئے۔ الجیریا نے کہا کہ ہمیں 'اسکول کے پروگراموں اور سکیورٹی فورسز کے لیے تربیتی پروگراموں میں انسانی حقوق کی تربیت اور تعلیم کو مستحکم کرنا' چاہئے۔ یعنی، ہمیں اپنی فورسز کو بھی انسانی حقوق کے احترام کی اہمیت کے بارے میں حساس بنانے کی ضرورت ہے۔ انڈونیشیا نے بھی یہی نقطہ اٹھایا۔

10 اقوام نے کہا کہ پاکستان کو 'تمام جرائم کے لیے سزائے موت کا خاتمہ' کرنا چاہئے یا 'سزائے موت پر پابندی دوبارہ بحال کرنی چاہئے' یا 'سزائے موت کا اطلاق کم سے کم کرنا چاہئے'۔

ہم نے گھانا کی یہ سفارش بھی قبول کرلی جس میں کہا گیا تھا کہ 'ہوائی، آبی اور زمینی آلودگی کے بچوں کی صحت پر اثرات کا جائزہ لیا جائے تاکہ صورتحال سے نمٹنے کے لیے مناسب وسائل کی حامل حکمت عملی تشکیل دی جاسکے'۔ یہ بات یاددہانی کے لائق ہے کہ عالمی بینک کی ایک حالیہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کے 40 فیصد بچوں کی مکمل نشوونما نہیں ہو پاتی۔

ہم نے سلووینیا کی سفارش بھی قبول کرلی جس میں کہا گیا تھا کہ 'بین الاقوامی معیارات کی مطابقت میں فوجداری نظام انصاف میں اصلاحات کے عمل کو مستحکم کیا جائے، بالخصوص منصفانہ ٹرائل کے حق، سویلین عدالتوں میں پیش ہونے کے حق اور کھلی سماعت کے حق کے حوالے سے، اور دہشت گردی سے متعلقہ جرائم میں، عام شہریوں کے مقدمات پر فوجی عدالتوں کے دائرہ کار کا خاتمہ کیا جائے'۔ اسے ہم نے قبول کرلیا۔ لیکن قبول کرنے کے بعد کیا ہوگا؟

'دس ممالک نے کہا کہ پاکستان کو تمام جرائم کے لیے سزائے موت ختم کردینی چاہئے یا سزائے موت پر پابندی بحال کرنی چاہئے'۔

ایک اور سفارش کا تعلق 'سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں سیاسی فیصلوں اور باجواز تنقید سے تھا'۔ ہم نے اسے یہ کہتے ہوئے تسلیم نہیں کیا کہ ملک میں ایسی کوئی

'12' ممالک نے ہمیں جبری گمشدگیوں کے خلاف معاہدے پر دستخط کرنے کو کہا ہے اور اس کے باوجود یہ ان 168 سفارشات میں شامل نہیں ہے جو ہم نے قبول کی ہیں۔ اسے صرف 'نوٹ' کیا گیا ہے۔

10 اقوام نے کہا کہ پاکستان کو 'تمام جرائم کے لیے سزائے موت کا خاتمہ' کرنا چاہئے یا 'سزائے موت پر پابندی دوبارہ بحال کرنی چاہئے' یا 'سزائے موت کا اطلاق کم سے کم کرنا چاہئے'۔

صورتحال نہیں۔ ایک اور سفارش یہ تھی کہ 'اظہار رائے کی آزادی، بشمول آن لائن آزادی کے تحفظ کے لیے اقدامات کیے جائیں'۔ یہ تجویز آسٹریلیا نے پیش کی تھی۔ ہم نے اسے نوٹ کیا، لیکن حمایت نہیں کی۔ سویڈن نے تجویز دی کہ 'صحافیوں اور میڈیا ملازمین کے خلاف جرائم' پر قابو پایا جائے۔' اسے ہم نے قبول کرلیا۔ اس کے باوجود، ہم نے ایک اور سفارش کو محض 'نوٹ' کیا جس میں کہا گیا تھا کہ 'آزاد صحافیوں اور میڈیا کو کسی بھی دھمکی یا تشدد، بشمول جبری گمشدگیوں سے تحفظ فراہم کیا جائے۔' ناروے نے تجویز کیا کہ ہم 'صحافیوں اور انسانی حقوق کے دفاع کاروں پر حملوں کی تمام اطلاعات کی تحقیقات کریں اور مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لائیں۔' ہم نے اسے قبول کرلیا۔ ایک اور سفارش (یونان کی جانب سے) یہ تھی کہ 'صحافیوں اور انسانی حقوق کے دفاع کاروں کے زندگی کے حق اور اظہار رائے کی آزادی کے تحفظ کے لیے اقدامات کیے جائیں اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ان کے خلاف تشدد کے مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔' ہم نے اسے بھی قبول کرلیا۔

کینیڈا نے تجویز کیا کہ ہم 'ایسے کسی بھی شخص کو انصاف کے کٹہرے میں لائیں جو انسانی حقوق کے دفاع کاروں، صحافیوں، بلاگروں یا ایسے افراد جو جمہوریت کے فروغ کے لیے کام کرتے ہوں، کو دھمکیاں دے، اغواء کرے یا ان پر حملہ کرے۔' ہم نے اسے نوٹ کیا۔ اگرچہ ہم نے ایسی دیگر سفارشات کو قبول کیا، تاہم اس سفارش میں 'بلاگروں' کا ذکر تھا اس لیے ہم نے فوراً کہہ دیا کہ ہم نے اسے 'نوٹ' کرلیا ہے، ہم اس کی حمایت نہیں کرتے۔ آسٹریلیا کی یہ تجویز کہ ہم 'ایسے قوانین متعارف کرائیں جو صحافیوں کے خلاف حملوں کو ممنوع قرار دیں، ان حملوں کی مؤثر تحقیقات کریں اور مجرموں کے خلاف قانونی کارروائی کریں جیسا کہ اس سے پہلے سفارش کی گئی تھی، اسے بھی نوٹ کیا گیا۔ ایک اور سفارش جسے نوٹ کیا گیا یہ تھی کہ پاکستان 'اقوام متحدہ کی تنظیم برائے تعلیم، سائنس و ثقافت کے ڈائریکٹر جنرل کی صحافیوں کی سلامتی اور سزا سے استثنا کے خطرے سے متعلق رپورٹ کے لیے، قتل ہونے والے صحافیوں کے مقدمات کی عدالتی حیثیت کے حوالے سے تازہ ترین معلومات فراہم کرے۔ اس کے باوجود، فریڈم نیٹ ورک نامی تنظیم نے حالیہ دنوں میں قتل ہونے والے صحافیوں کی تعداد اور ان قاتلوں، جنہیں کوئی سزا نہیں ہوئی، کی تعداد سے متعلق ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا حکومت نے ان کے مقدمات کی پیروی میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ صرف ایک ملزم کو سزا ہوئی۔

اگلی سفارش فرانس کی طرف سے کی گئی جو یہ تھی کہ 'صحافیوں اور انسانی حقوق کے دفاع کاروں کے تحفظ کے لیے انتظامی اور قانونی اقدامات جاری رکھے جائیں اور یقینی بنایا جائے کہ ان کے خلاف تشدد کے مجرموں کو عدالتوں میں پیش کیا جائے۔' مصر نے تجویز دی کہ ہمیں 'ان اقدامات پر عملدرآمد کرنا چاہئے جن کا مقصد سرکاری امور میں اقلیتوں کی شرکت کو یقینی بنانا ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے، کیا ہم نے ایسا نہیں کہا کہ ہم نے اقلیتوں کی سرکاری امور میں شرکت کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں؟ یہ کہا گیا کہ اگر پاکستان نے یہ اقدامات کیے ہیں تو پھر اسے ان پر عملدرآمد یقینی بنانا چاہئے۔

> ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم اقوام متحدہ کو ان اقدامات سے آگاہ رکھیں جو ہم ان سفارشات پر عملدرآمد کے لیے کر رہے ہیں جنہیں ہم نے قبول کیا ہے۔ میں ہر ایک سے کہنا چاہوں گا، خاص کر ان سے جو انسانی حقوق کے لیے کام کرتے ہیں، کہ وہ اقوام متحدہ کی رپورٹ اور اس پر پاکستان کے ردعمل کا مطالعہ کریں جس میں اس نے ان اقدامات کا ذکر کیا ہے جنہیں یہ قبول کرے گا یا جنہیں قبول نہیں کرے گا۔

ایسے کئی نکات اور بھی ہیں: جیسے کہ 'کم آمدن والے گھرانوں کو مالی مدد کی فراہمی جاری رکھی جائے' اور 'معاشی ترقی کا حصول جاری رکھا جائے تاکہ آبادی کے معیار زندگی کو بہتر بنایا جاسکے اور غریب لوگوں کے سماجی حالات، صحت اور تعلیمی حالت کو بہتر بنایا جاسکے۔' سماجی برابری اور غربت میں کمی سے متعلق بھی کئی نکات ہیں۔ ان سب میں میرے نزدیک جو بنیادی نقطہ ہے وہ یہ ہے کہ یہ سفارشات لوگوں کے بنیادی حقوق کا حصہ ہیں۔ جیسے کہ لوگوں کو سماجی تحفظ، نگہداشت صحت، تعلیم فراہم کرنا، صحافیوں اور انسانی حقوق کے دفاع کاروں کا تحفظ کرنا۔' ان میں ایسی کوئی بات نہیں جو ہمارے خلاف ہو۔ یہ محض ریاست کی ذمہ داریاں ہیں۔

ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم اقوام متحدہ کو ان اقدامات سے آگاہ رکھیں جو ہم ان سفارشات پر عملدرآمد کے لیے کر رہے ہیں جنہیں ہم نے قبول کیا ہے۔ میں ہر ایک سے کہنا چاہوں گا، خاص کر ان سے جو انسانی حقوق کے لیے کام کرتے ہیں، کہ وہ اقوام متحدہ کی رپورٹ اور اس پر پاکستان کے ردعمل کا مطالعہ کریں جس میں اس نے ان اقدامات کا ذکر کیا ہے جنہیں یہ قبول کرے گا یا جنہیں قبول نہیں کرے گا۔ ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم حکومت پر زور دیں کہ وہ اس رپورٹ کو عام کرے، اور ہمیں چاہئے کہ ہم یہ پڑھیں کہ حکومت کیا جواب جمع کراتی ہے۔ یہ سرکاری دستاویزات ہیں۔ ہم مستقبل میں یہ بھی مطالبہ کرسکتے ہیں کہ حکومت عوام کو بتائے کہ ایسے موقعوں پر کیا کچھ کہا جاتا ہے، اسے کونسی سفارشات موصول ہوتی ہیں، کونسے وعدے کیے جاتے ہیں۔ کیونکہ جب آپ کسی سفارش کو قبول کرتے ہیں تو یہ ایک ذمہ داری بن جاتی ہے۔ ہمیں حکومت سے سوال کرتے رہنا چاہئے کہ یہ ان ذمہ داریوں کو کس طرح پورا کرے گی۔

'ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم حکومت پر زور دیں کہ وہ یو پی آر کی رپورٹس کو عام کرے، اور یہ کہ ہماری حکومت جو دستاویزات جمع کراتی ہے ہم ان کا مطالعہ کریں۔'

ہمارے ملک میں یہ تاثر عام ہے کہ ساری دنیا ہمارے خلاف ہے۔ کوئی بھی ہمارے خلاف نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، (یو پی آر ورکنگ گروپ) کی رپورٹ کے 154 پیراگراف میں صرف پاکستان کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کے بعد، انہوں نے کہا: اب ہم نے آپ کی بات سن لی ہے۔ یو پی آر میں 111 ممالک نے گفتگو کی اور ان سب نے اپنی تجاویز دیں: جبوتی، قبرص، سوڈان، نائجیریا، اومان۔ اور بڑے ممالک نے بھی۔ جن ممالک نے پیشگی سوالات بھیجے ان میں بیلجیئم، برازیل، سلووکیا، ایسٹونیا، جرمنی، ناروے، پرتگال، سلووینیا، سپین، سوئٹزرلینڈ، برطانیہ، امریکا۔۔۔ شامل تھے۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، اس فہرست میں صرف بڑے ممالک نہیں ہیں، اس میں چھوٹے ممالک بھی ہیں۔ اسی لیے، پاکستان کے خلاف کوئی سازش نہیں ہورہی۔

یورپی یونین کے ساتھ ہمارے جی ایس پی پلس معاہدے میں، جو بھی نقطے اٹھائے گئے ہیں وہ پاکستان کے مفاد میں ہیں یا ان کا مقصد پاکستان کی مدد کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اپنے مزدوروں کے (کام کے حالات) کے معیار کا جائزہ لیں، اپنے لوگوں کا خیال رکھیں، ان 27 معاہدوں کا نفاذ کریں جن میں سے 7 انسانی حقوق کے معاہدے، 8 آئی ایل او کے کنونشن، سات یا آٹھ ماحولیات سے متعلق ہیں اور ایک کا تعلق بدعنوانی سے ہے۔ میں یہ اس لیے کہتا ہوں کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے لوگ ہمارے خلاف ہیں۔ لیکن کوئی ہمارے خلاف نہیں ہے، سوائے ہمارے۔ ہمیں کم از کم ان کی (ہماری انسانی حقوق کی صورتحال پر تبصرہ کرنے والے ممالک) بات سننی چاہئے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہ سب ایک طرف، ہمارے تمام سابقہ معاہدوں میں، جو اب بھی ایک راز ہیں، ہمارے خلاف گئے۔ امریکا کے ساتھ 1951ء کا دفاعی معاہدہ ہمارے خلاف گیا۔ 1954ء کا سیٹو معاہدہ ہمارے خلاف گیا۔ 1954ء کا سینٹو معاہدہ ہمارے خلاف گیا۔

1988ء میں ہماری حکومت نے عالمی بینک کے ساتھ سٹرٹیجک افہام وتفہیم سے متعلق ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ دونوں فریق اس معاہدے کو عام کریں گے۔لیکن یہاں، یہ آج تک ایک راز ہے۔اگر ڈاکٹر مہدی حسن (چیئر پرسن ایچ آر سی پی) یا میں اس معاہدے کے کسی حصے کا حوالہ دیں تو ہم جرم کے مرتکب ہوں گے۔تقریباً 10 سال پہلے تک، جو کوئی بھی واشنگٹن، ڈی سی میں عالمی بینک کے دفتر جا کر اس معاہدے کی دستاویزات طلب کرتا تھا تو اسے یہ دستاویزات دی جاتی تھیں۔بعدازاں، ہماری حکومت نے اس پر پابندی لگادی۔لندن میں میری دو محققین سے ملاقات ہوئی جنہوں نے بتایا کہ وہ وہاں گئے اور ان دستاویزات کا تقاضہ کیا، لیکن انہیں یہ دستاویزات نہیں دی گئیں۔انہوں نے بتایا کہ انہیں ان دستاویزات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا بلکہ انہیں یہ بھی کہا گیا کہ وہ دوسروں کو ان کے بارے میں نہ بتائیں۔ہمارا مطالبہ ہے کہ اس رپورٹ کو پارلیمنٹ کے ڈیسک پر رکھا جائے۔ کیا یہ ایک معقول درخواست نہیں ہے؟

اس وقت، جب کسی معاہدے کی توثیق کی جاتی ہے تو وزارت امور خارجہ محض اس پر دستخط کردیتی ہے۔حتیٰ کہ اراکین پارلیمنٹ بھی نہیں جانتے کہ ہم نے کونسے معاہدوں پر دستخط کررکھے ہیں، کیونکہ انہیں کبھی اس بارے میں نہیں بتایا جاتا۔ یہ بہت جائز مطالبہ ہے کہ حکومت — اچھے یا برے، مالی یا سماجی — جو بھی معاہدے کرتی ہے ان کی ایک نقل پارلیمنٹ کے دفتر میں رکھی جائے تاکہ ہمارے نمائندے کچھ مفید معلومات سے آگاہ ہوں اور اپنے لوگوں پر توجہ دیں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں، انسانی حقوق کے نقطہ نظر سے، کہ میں اس بارے میں گفتگو کیوں کررہا ہوں۔ میں اس پر اس لیے زور دیتا ہوں کہ انسانی حقوق جامد نہیں ہیں، بلکہ یہ قابل ارتقاء ہیں۔مثال کے طور پر، کوئی بھی اس حقیقت پر توجہ نہیں دیتا کہ جمہوریت ہمارا بنیادی انسانی حق ہے، ایسی جمہوریت جو آزاد ہو، جس میں مرحلہ وار انتخابات ہوں۔ یہ ایک بنیادی انسانی حق ہے۔ہاں، ہر کسی کو ووٹ ڈالنے کی اجازت ہے، اور اسے تسلیم کیا گیا ہے۔لیکن ہم چاہیں گے کہ ریاست اس حوالے سے شبہات کو دور کرے اور آئین میں لکھے کہ 'منتخب لوگوں کی طرف سے جمہوری طریقے سے نظام حکومت چلایا جانا ایک بنیادی حق ہے۔'

'آئین میں یہ درج ہونا چاہئے کہ منتخب لوگوں کی طرف سے جمہوری طریقے سے نظام حکومت چلایا جانا ایک بنیادی حق ہے۔'

آیئے، اب زندگی کے حق کی بات کرتے ہیں — زندگی کا حق کیا ہے؟' کسی کو بھی زندگی سے محروم نہیں کیا جائے گا ماسوائے قانون کے مطابق۔'اس بارے میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ برطانیہ نے ہمیں ضابطہ تعزیرات دیا: اگر آپ کسی کی جان لیتے ہیں تو یہ قتل ہے اور پھر قتل کا ٹرائل ہوگا۔ جب آپ قانون سے ماورا ہو کر کسی کی جان لیتے ہیں تو یہ قتل ہے۔پس، آپ نے کیا کیا ہے؟ ریاست کوئی ذمہ داری نہیں لیتی۔

اب جمہوریت کی بات کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ، برطانہ میں لیبر پارٹی دو ووٹوں کی اکثریت سے انتخابات جیت گئی۔ان میں سے ایک سپیکر بن گیا، یوں ایک ووٹ کا فرق باقی رہ گیا۔

یہ اسی بیان کی طرح ہے کہ،' محض جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائیگا'۔لیکن اگر ایسا ہو تو کیا کیا جائے گا؟ کسی گاؤں سے تعلق رکھنے والی عورت کو عدالت جانا پڑے تو وہ کیسے جاسکتی ہے؟ اسے کوئی رسائی نہیں۔وہ وکیل کی خدمات حاصل نہیں کرسکتی۔ ریاست کو پڑھنا چاہئے کہ:'ریاست یقینی بنائے گی کہ محض جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا'۔جب آپ اس بات کو ایک تائیدی زبان میں کہتے ہیں تو کوئی بھی خلاف ورزی قابل دخل اندازی ہوگی، جس کے لیے پھر ریاست کو قوانین بنانا ہوں گے۔

اب جمہوریت کی بات کرتے ہیں۔ایک مرتبہ، برطانیہ میں لیبر پارٹی دو ووٹوں کی اکثریت سے انتخابات جیت گئی۔ ان میں سے ایک سپیکر بن گیا، یوں ایک ووٹ کا فرق باقی رہ گیا۔حکومت نے اسی ایک ووٹ کی اکثریت پر کچھ عرصہ حکومت کی، لیکن چند ماہ کے بعد انتخابات کا اعلان کیا اور اپنی اکثریت میں اضافہ کیا۔اکثریت پسند ریاست کا تصور یہ ہے کہ، اگر اس کے پاس ایک ووٹ کی بھی اکثریت ہے تو اسے پالیسیاں بنانے کا حق ہے۔لیکن دنیا نے اس تصور کو مسترد کردیا ہے۔ دنیا اکثریت پسند ریاست کو استبدادی نظام قرار دیتی ہے۔اگر آپ کے پاس دس لوگ مزید ہوں تو آپ اکڑ کر اور سینا پھلا کر چل سکتے ہیں۔اگر دوسری طرف 10 لوگ کم ہیں تو اس کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔اسی وجہ سے، شرکت جتنی زیادہ ہو اتنا بہتر ہے۔اب، جمہوریت کی تعریف اکثریت کی اصطلاح میں نہیں، بلکہ منتخب لوگوں کی سب سے بڑی تعداد کی شرکت کے حوالے سے کی جاتی ہے۔

'نئے حقوق متعارف کیے گئے ہیں، مثال کے طور پر، ترقی کا حق۔ایک اور نیا حق صحت مند ماحول کا حق ہے۔'

کئی نئے حقوق متعارف ہوئے ہیں، مثال کے طور پر، ترقی کا حق۔ایک اور حق صحت مند ماحول کا حق ہے۔اور ماحولیاتی حقوق بہت وسیع ہیں۔ یہاں، لوگ سوچتے ہیں کہ 'ماحولیاتی (مسائل) سے مراد صرف پانی یا ہوا کی آلودگی ہے — اور لاہور کی ہوائی آلودگی منظور شدہ حد سے زیادہ ہے — لیکن 'ماحولیاتی تحفظ' کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہمیں اپنے دریاؤں، پہاڑوں، زمین کو تباہ نہیں کرنا چاہئے۔ یہ ہماری دولت ہیں اور ان ناقابل تجدید وسائل کا تحفظ کرنا ہوگا۔ درحقیقت، ایران میں انسانی حقوق کے باب میں ماحولیات کے متعلق شق بھی شامل ہے، ایسا دیگر ممالک میں بھی ہے۔

میرا نقطہ یہ ہے کہ: ان بنیادی حقوق کو آئین میں شامل ہوئے 70 برس گزر چکے ہیں؛ انہیں محض ایک تعویز میں تبدیل کردیا گیا ہے اور اب ہم مزید پیش رفت نہیں کرسکتے۔ پس، کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ پیپلز پارٹی دوبارہ اقتدار میں آئے یا یہ کہ انقلاب یا ایک نئے آئین کی ضرورت ہے؟ کیا اس سے مسائل ہوجائیں گے؟ نہیں۔ بہت سے ترقی یافتہ ممالک میں ایک شعبہ موجود ہے جو اس بات کا تعین کرتا ہے کہ حکومت اپنے اس کام کو کیسے بہتر بنا سکتی ہے جو وہ انسانی حقوق کے لیے کررہی ہے، اپنے لوگوں اور دنیا بھر کے لوگوں کے انسانی حقوق کو یقینی بنانے کے لیے مزید کیا کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایسا نظام ہونا چاہئے۔ ہر سال، دو سال یا چار سال بعد ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ ہمارے انسانی حقوق پر کس حد تک عمل درآمد ہوا ہے اور بہتری کی گنجائش کہاں پر ہے۔

'جمہوریت کی تعریف اکثریت کی اصطلاح میں نہیں، بلکہ منتخب لوگوں کی سب سے بڑی تعداد کی شرکت کے حوالے سے کی جاتی ہے۔

جب چوتھا یو پی آر ہوگا تو جائزے کے لیے جو رپورٹ تیار کی جائے گی اس میں ہماری (سول سوسائٹی) کی مشاورت شامل ہونی چاہئے۔اگلے جائزے سے ایک سال قبل، عوام کو اپنے جاننے کے حق کو استعمال کرتے ہوئے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ پاکستان نے جن سفارشات کی حمایت کی تھی ان میں سے کتنی سفارشات پر عملدرآمد اور نفاذ ہوا۔اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو پھر ہم یہ سوچتے رہیں گے کہ ہمارے پاس جو انسانی حقوق ہیں سو ہیں (یعنی یہ سب کافی ہیں)۔اور جو حقوق ہمارے پاس نہیں ہیں، ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

آخر میں، مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ 2012ء اور 2017ء میں، پاکستان کی کئی تنظیموں نے اپنی تجاویز بھیجیں۔ کچھ تنظیموں نے مشترکہ طور پر، کچھ نے انفرادی طور پر۔اور اقوام متحدہ کے دفتر نے انہیں قلمبند کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ پاکستان کی سول سوسائٹی کی جانب سے پیش کی گئیں سفارشات ہیں۔ان پر مناسب توجہ دی جانی چاہئے۔

سکول میں خاتون ٹیچر کی ہلاکت کے وقوعے کی جانچ پڑتال

ملتان 13 مئی 2019 کو ملتان کے علاقہ شاہ رکن عالم کالونی میں واقع پرائیویٹ لاریٹس پبلک سکول کی برانچ حارث کیمپس میں 21 سالہ ٹیچر اسماء بی بی انگلش لینگویج ٹرینگ کورس کے دوران گر کر ہلاک ہوگئی جسے رکشہ میں قریبی اشرف نصیر ہسپتال لے جایا گیا جہاں پر موجود ڈاکٹر نے حالت زیادہ تشویش ناک ہونے پر نشتر ہسپتال ملتان لے جانے کا کہا جس پر 1122 ایمبولینس کے ذریعہ اسماء بی بی کو نشتر ہسپتال ملتان لے جایا گیا۔نشتر ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں موجود ڈاکٹرز نے اسماء بی بی کو مردہ قرار دے دیا۔اسماء بی بی کے ورثاء نے پوسٹ مارٹم کرانے سے انکار کر دیا اور لاش کو لے کر آبائی قبرستان قصبہ مڑل ملتان میں تدفین کر دی۔اس واقعہ کی اخبار میں خبر شائع ہونے پر 16 مئی 2019 کو ڈپٹی کمشنر ملتان عامر خٹک نے واقعے کا نوٹس لیتے ہوئے انکوائری کمیٹی تشکیل دی جس میں ڈپٹی کمشنر ریونیو آغا اظہر عباس شیرازی کو کمیٹی کا سربراہ مقرر کیا جبکہ کمیٹی کے دیگر اراکین میں احمد نواز ڈی ایس پی، منصور قاضی اسسٹنٹ کمشنر ملتان اور شمشیر احمد چیف ایگزیکٹو آفیسر ایجوکیشن شامل تھے۔انہیں ہدایت دی گئی کہ تین دن کے اندر اپنی انکوائری رپورٹ مکمل کر کے پیش کریں۔اس کمیٹی نے سکول انتظامیہ کے مبینہ ناروا سلوک سے متعلق تحقیقات کرنا تھی۔

ایچ آر سی پی کی ملتان ٹاسک فورس نے اس سانحہ کے حقائق جاننے کے لئے ایچ آر سی پی کے کونسل ممبر نذیر احمد کی سربراہی میں ایک ٹیم تشکیل دی جس میں عاصمہ خان ایڈووکیٹ، نوشین بلوچ ایڈووکیٹ اور فیصل محمود کوآرڈینیٹر ملتان ٹاسک فورس شامل تھے۔تحقیقاتی ٹیم نے متوفیہ سکول ٹیچر اسماء کے والد حافظ غلام یاسین کا مئوقف جاننے کے لئے ان کے آبائی گاؤں چاہ پیر والا موضع چاہان میرن نزد عیسیٰ والی پلی قصبہ مڑل کا دورہ کیا۔

متوفیہ کے والد کا بیان :

متوفیہ اسماء کے والد حافظ غلام یاسین نے تحقیقاتی ٹیم کو بتایا کہ میں جوتے بنانے والی فیکٹری میں مزدوری کرتے ہیں اور علاقہ کی مسجد کے امام بھی ہیں ان کے 6 بچے ہیں جن میں 3 بیٹے اور 3 بیٹیاں ہیں۔ متوفیہ اسماء سب سے چھوٹی تھی جس نے بہاءالدین زکریا یونیورسٹی سے بی۔اے کیا ہوا تھا اور مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔اپنے اور چھوٹے بھائی مزمل یاسین کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے پچھلے آٹھ ماہ سے لاریٹس سکول کی برانچ حارث کیمپس میں پڑھا رہی تھی اور سکول سے چھٹی کے بعد اپنے ماموں حافظ محمد اصغر کے پاس شاہ رکن عالم کالونی کے جی بلاک میں رہائش پذیر تھی جہاں پر شام کے وقت بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی۔لاریٹس سکول والے آٹھ ہزار روپے ماہوار تنخواہ دیتے تھے۔اس آٹھ ماہ کے عرصہ کے دوران متوفیہ اسماء نے سکول کے سٹاف کے رویے بارے انہیں کوئی شکایت نہیں کی۔چونکہ وقوعہ والے دن وہ یہاں موجود نہیں تھا اس سلسلہ میں بہتر معلومات اس کا بیٹا مزمل یاسین ہی دے سکتا ہے۔تدفین والے دن خالد جاوید وڑائچ جو کہ لاریٹس سکول سسٹم کا مالک ہے نے فون پر رابطہ کیا اور کہا کہ آپ کے بیٹے مزمل یاسین کے تعلیمی اخراجات میں دیتا رہوں گا جب تک وہ برسر روزگار نہیں ہو جاتا میں نے انکار کر دیا۔انہوں نے مزید بتایا کہ ابھی تک ڈپٹی کمشنر کی قائم کردہ انکوائری ٹیم نے ان کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی ان کا بیان ریکارڈ کیا گیا ہے۔انہیں اس بات پر بہت افسوس ہے کہ سکول میں گاڑیاں ہونے کے باوجود ان کی بیٹی کو رکشہ میں ہسپتالوں میں پھراتے رہے موقع پر کوئی طبی امداد نہ دی گئی جس کی وجہ سے ان کی بیٹی کی جان چلی گئی۔انہوں نے سکول انتظامیہ کے خلاف سٹی پولیس آفیسر ملتان کو قانونی کاروائی کے لئے درخواست دے دی ہے۔

مزمل یاسین (بھائی) کا بیان

وقوعہ والے دن وہ اپنے ماموں حافظ محمد اصغر کے گھر موجود تھا۔ میرے ماموں دفتر گئے ہوئے تھے کہ مجھے صبح پونے گیارہ بجے سکول کے نمبر سے کال آئی کہ اسماء اچانک گر گئی ہے اور اس کے سر پر چوٹ آئی ہے ہم اسے اشرف نصیر ہسپتال لے کر جا رہے ہیں آپ فوراً پہنچیں ۔میں اور میری ممانی فوراً رکشہ پر اشرف نصیر ہسپتال واقع جناح چوک پہنچے۔تو وہاں پر ہمیں معلوم ہوا سکول والے 1122 ایمبولینس پر نشتر ہسپتال لیکر چلے گئے ہیں ہم سیدھا نشتر ہسپتال پہنچے تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ اسماء کا انتقال ہو گیا ہے۔اس دوران ہمارے باقی گھر والے بھی نشتر پہنچ گئے۔

حافظ محمد اصغر (متوفیہ کے ماموں) کا بیان

اسماء میٹرک سے لیکر اب تک میرے گھر میں ہی رہائش پذیر تھی۔ اسے مزید پڑھنے کا شوق تھا اس وجہ سے وہ نوکری کر کے اپنا اور اپنے بھائی مزمل یاسین کے تعلیمی اخراجات پورے کر رہی تھی۔سکول میں جب یہ سانحہ ہوا تو حارث جاوید وڑائچ پرنسپل موجود تھا اس کی گاڑی بھی موجود تھی لیکن وہ گاڑی کی بجائے آٹو رکشہ میں اسماء کو اشرف نصیر ہسپتال لے گئے۔اس کا یہ رویہ ہمارے لئے قابل افسوس ہے۔

خالد جاوید وڑائچ (چیف ایگزیکٹو لاریٹس گروپ آف سکولز)

لاریٹس گروپ آف سکولز کے چیف ایگزیکٹو اور پاکستان تحریک انصاف جنوبی پنجاب کے سینئر نائب صدر خالد جاوید وڑائچ نے تحقیقاتی ٹیم کو بتایا کہ ان کے سکول کی ٹیچر اسماء بی بی کی موت ایک حادثہ تھا ۔حادثہ والے دن انگلش لینگویج کی ٹرینگ کورس کے دوران کلاس میں 35 اساتذہ موجود تھیں۔جب اسماء کو سٹیج پر بلایا گیا جونہی اسماء بی بی سٹیج پر پہنچی کہ اچانک چکرا کر دیوار کے ساتھ ٹکرا کر زمین پر گر پڑی جس سے اس کے سر پر چوٹ لگی۔اسماء کے گرنے کے فوری بعد میرے بیٹے پرنسپل سکول حارث جاوید وڑائچ، قمر حسین اور کوآرڈینٹر میڈم نرگس انہیں فوری طور قریبی پرائیویٹ اشرف نصیر ہسپتال لے گئے۔میڈم نرگس ٹیچر اسماء کے ساتھ رکشہ میں موجود تھی جبکہ باقی لوگ پیچھے گاڑی میں ہسپتال پہنچے۔حالت زیادہ خراب ہونے پر اسماء بی بی کو 1122 ایمبولینس پر نشتر ہسپتال ملتان لایا گیا وہاں پر میری بیوی، میرا بیٹا اور ٹیچر اسماء کے لواحقین بھی موجود تھے۔اسماء کے لواحقین نے پوسٹ مارٹم کرانے سے انکار کر دیا۔خالد جاوید وڑائچ نے تحقیقاتی ٹیم کو جائے حادثہ کا معائنہ بھی کرایا جہاں پر اسماء بی بی گر کر زخمی ہوئی تھی۔خالد جاوید وڑائچ نے اس بات کی تردید کی کہ ان کے سکول کے پرنسپل کا رویہ اپنے سٹاف کے ساتھ سخت ہوتا ہے ''یہ صرف اخباری بیانات ہیں۔میرے ادارے کو 27 سال ہو گئے ہیں آج تک کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا ہے''۔سٹاف اور طالبعلموں کی صحت اور سکیورٹی کے متعلق سوال کے جواب میں خالد جاوید وڑائچ نے کہا کہ ہمارے ادارے نے ایک لیڈی ڈاکٹر انیلہ رکھی ہوئی ہے جو صحت سے متعلق مختلف اوقات میں لیکچر دیتی رہتی ہیں۔سکول کی عمارت کے گیٹ سول ڈیفنس کی ہدایت کے مطابق لگائے ہوئے ہیں۔سکول سٹاف کی تنخواہ کے حوالے سے بتایا کہ سٹاف کو ان کی صلاحیت کے مطابق تنخواہ دی جاتی ہے متوفیہ اسماء بی بی کو 8 ہزار روپے تنخواہ دی جاتی تھی۔

محمد افضل SI (تفتیشی افسر مقدمہ)

محمد افضل SI تھانہ شاہ رکن عالم نے بتایا کہ ڈپٹی کمشنر ملتان کے حکم پر متوفیہ اسماء کے والد حافظ غلام یاسین کی مدعیت میں لاریٹس سکول کے چیف ایگزیکٹو اور مالک خالد جاید وڑائچ، سکول پرنسپل حارث جاوید وڑائچ اور میڈم نرگس کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا ہے۔ملزمان نے ملتان کی سیشن کورٹ سے 12 جون 2019 تک ضمانتیں قبل از گرفتاری کرالی ہیں۔مزید تفتیش جاری ہے۔

فیکٹ فائنڈنگ ٹیم کے مشاہدات:

☆ سکول انتظامیہ کی مجرمانہ غفلت کی وجہ سے ٹیچر اسماء کی موت واقع ہوئی اگر اسے بروقت طبی امداد مل جاتی تو شائد اس کی زندگی بچ جاتی۔

☆ تحقیقاتی ٹیم کو یہ جان کر بڑی حیرانی ہوئی کہ سکول میں موقع پر دو گاڑیاں موجود تھیں پھر بھی متوفیہ اسماء کو رکشہ میں ہسپتال لے جایا گیا۔

☆ موقع پر 1122 ایمبولینس کو کال نہیں کیا گیا جس سے شک و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

☆ سکول میں ایمرجنسی حالات سے نمٹنے کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام موجود نہیں تھا۔

☆ سکول سٹاف اور طالب علموں کی صحت و سلامتی کے لئے کوئی منظم نظام دیکھنے کو نہیں ملا۔

سفارشات:

☆ تمام سرکاری اور غیر سرکاری سکولوں میں ہیلتھ کیئر کے لئے مناسب تربیت اور اور کسی ماہر ڈاکٹر کی خدمات ضروری قرار دی جائیں۔

☆ ایسے تمام پرائیویٹ سکولوں کی رجسٹریشن منسوخ کی جائیں جو بمطابق قانون سٹاف کو تنخواہیں نہیں ادا کرتے۔

☆ لاریٹس گروپ آف سکولز کے چیف ایگزیکٹو موجودہ حکمران جماعت کے ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں جس سے مقدمہ کی تفتیش متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔اس لیے اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ ان کی سیاسی حیثیت اور اثر و رسوخ مقدمہ کی تفتیش کو متاثر نہ کر سکے۔

(فیصل تنگوانی)

ہم تعلیم سے کیا توقع رکھتے ہیں؟

کے ٹی مارگریٹ

ایک نوجوان ماں نے ابھی حال ہی میں مجھ سے پوچھا، "مجھے اپنی بیٹی کو کیسے پڑھانا چاہیے کہ جس سے وہ ہمارے جیسے معاشرے میں رہ بھی سکے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی حقیقی ذات کا ادراک بھی کر سکے؟ میرا خیال ہے اگر میں ایسا کرنے کی کوشش تی ہوں تو پھر وہ اس معاشرے میں زندہ نہیں رہ سکے گی۔" یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے جس کا والدین اور اساتذہ سامنا کر رہے ہیں، اور ہمیں یہ سوال کرنے کی ضرورت ہے:

ہم اپنے بچوں کے لیے کس قسم کی تعلیم چاہتے ہیں؟ کیا ہمیں اپنے بچوں کو ایسی تعلیم دینی چاہیے جس سے وہ اپنے اصلی وجود کو پہچان سکیں؟ یا انہیں یہ ہی پڑھانا کافی ہے کہ وہ اچھا رویہ اختیار کیا کریں اور خود انحصاری حاصل کریں اور دنیاوی کامیابی حاصل کرنے کے قابل بن جائیں۔ کیا تعلیم کا ایسا تصور اپنانا ضروری ہے جو ہمارے بچوں کے لیے فائدہ مند ہو؟

زیادہ تر لوگوں کے سر پر مادی خوشحالی کا جنون طاری ہے اور ایسے لوگ کم ہیں جنہیں اپنی حقیقی ذات کو پہچاننے کی جستجو ہے۔ اس لیے تعلیم میں رویوں اور اقدار کی تشکیل پر بہت کم زور دیا جاتا ہے۔ ہمدردی، اور دوسروں کے خیالات و احساسات کے لیے احترام، دیانتداری کے ساتھ بات چیت اور دوسروں کے ساتھ تعاون جیسی اقدار اتنی اہم نہیں سمجھی جاتیں کہ انہیں تعلیم کے لیے ذریعے سکھایا جائے۔ اس کی بجائے زور دنیاوی کامیابی حاصل کرنے پر اور بہترین ترکی بقاء پر ہے۔

کئی برسوں سے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جب میں اپنی ذات اور بیرونی دنیا، دونوں کا سامنا کرنے کے لیے آمادہ ہوتی ہوں تو میری ذات میں ایک مثبت تبدیلی آجاتی ہے۔۔۔ ایک ارتقاء جسے حقیقی معنوں میں 'تعلیم' کہتے ہیں۔ تعلیم کا یہ ذاتی عمل ان بچوں کی تعلیم کے لیے ضروری ہے جو میرے شاگرد ہیں۔ جب میں یہ کہتی ہوں تو میرا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں کوئی مختلف انسان بن جاتی ہوں، مگر میری ذات میں مسلسل تعمیر نو کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے میرے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ میں اپنے طالبعلموں کی رہنمائی کر سکوں کہ وہ اپنی منفرد شخصیات کی کھوج لگائیں۔

تعلیم یافتہ بننے اور تعلیم کے حصول میں دوسروں کی مدد کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری نظر میں تعلیم کا جو مقصد ہے ہم اس کے مطابق ڈھل جائیں۔

اس کتاب میں فرد کے تعلیمی عمل پر زور دیا گیا ہے۔ یہ کتاب بطور استاد میری زندگی کی داستان ہے، اور اس میں گذشتہ تیس برسوں کے دوران مختلف حالات میں پیش آنے والے میرے تدریسی تجربات بیان ہیں۔

میرا ارادہ یہ نہیں کہ میں تعلیمی عمل کے متعلق کوئی خیالی علم پیش کروں، یا ٹھوس نتائج یا نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کمرہ جماعت میں مختلف طریقوں کے اطلاق کے بارے میں بتاؤں۔ اس کتاب میں ایسے عمل کے بارے میں بتایا گیا ہے جو استاد اور طالبعلم دونوں کو اپنی ذات کا شعور دے سکے، اور ایسی تبدیلی لا سکے جو ہمیشہ بظاہر نظر تو نہیں آتی، مگر کمرہ جماعت میں مثبت اثر ضرور پیدا کرتی ہے۔

کمرہ جماعت میں استاد کے لیے کئی مواقع پیدا ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کا ادراک کر سکے، طالبعلموں کی نشوونما اور ترقی کے عمل میں ان کی مدد کر سکے۔ تاہم، مجھے ابھی تک ایسا کوئی تحریری مواد نہیں ملا جس سے تعلیم کے اس پہلو کے متعلق کوئی عملی رہنمائی مل سکے۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے کئی نوجوان استاد ہیں جو تعلیمی عمل کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں، اور اس کتاب کے ذریعے میں انہیں اپنے تجربات اور اپنے تیار کردہ طریقوں کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتی ہوں

اساتذہ اگر بچوں کی دیکھ بھال میں ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ انہیں پتہ ہو کہ ان کی اپنی نشوونما کیسی ہوئی تھی۔ میرے خیال میں جس استاد کو اپنی اندرونی حقیقت کا علم نہیں ہے، اور اسے یہ نہیں پتا کہ اس نے اسے بیرونی دنیا کے ساتھ جوڑنا کیسے ہے، وہ بچوں کی رہنمائی کی ذمہ داری نہیں لے سکتا/ لے سکتی۔

آسانی کے لیے، میں نے اپنے تعلیمی تجربات کو تاریخ وار ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ جیسے جیسے میں نے ایک ادارے سے دوسرے ادارے کی طرف سفر کیا اسی ترتیب سے میں نے چیزیں بیان کی ہیں۔

اس کام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ بچوں کی مدد کی جائے کہ وہ اپنی اسکولنگ کے پہلے چار یا پانچ برسوں کے دوران اپنے ذہن، دل، جسم اور روح کا استعمال کر کے اپنی مضبوط بنیاد بنائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے انہیں اپنی مکمل شخصیت بنانے میں مدد ملے گی اور وہ استاد پر زیادہ انحصار کیے بغیر سیکھنے کے قابل بن جائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ، انہیں بالغ استاد کے ساتھ فطری انداز میں میل جول کرنے، اس کے ساتھ اپنے تعلیمی تجربات شیئر کرنے اور تخلیقی و تعمیری انداز میں سوچنے اور عمل کرنے میں مدد ملے گی۔

پوری کتاب میں میں تعلیم کے تصور کا فلسفہ اور نظریہ بیان کروں گی جو میں نے اپنی تربیت، تدریسی تجربات، اور تعلیمی مطالعے کے ذریعے اپنایا۔ میں اپنے تیار کردہ طریق ہائے کار کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے جہاں ممکن ہوا کوشش کروں گی کہ کمرہ جماعت میں پیش آنے والی عملی مثالوں کا بھی ذکر کروں۔

تعلیم سے کیا مراد ہے؟

تعلیم سے مراد کسی فرد کی حقیقی ذات کی دریافت کرنا، اور اسے اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنے ذہن، جسم، اور روح کی فطری خوبیوں کی آبیاری اور ان خوبیوں کو بیرونی دنیا میں اچھی طرح استعمال کرنے کی صلاحیت حاصل کر لے۔ تعلیم ہماری زندگیوں کے لیے ضروری تو ہے مگر یہ ایک ایسا تصور ہے جس کی سب سے زیادہ غلط تشریح ہوئی ہے، اسے سب سے زیادہ غلط طریقے سے سمجھا گیا ہے اور اس کا سب سے زیادہ غلط استعمال ہوا ہے۔ اس کی ایک مثال ہمارا رسمی تعلیم کا نظام ہے جہاں سمجھا جاتا ہے کہ بندہ کئی برسوں تک باقاعدہ تعلیم و تربیت کے عمل سے گزر کر تعلیم یافتہ بن جاتا ہے۔ روایتی اسکول کئی بار بچے کی اس ضرورت کو نظرانداز کر دیتا ہے کہ اسے اپنی اندرونی حقیقت کو بیرونی دنیا کے ساتھ جوڑنا ہے، اور روایتی اسکول بچے کو ایسی تعلیم و تربیت دینے میں بھی ناکام رہتا ہے جو اس کی ضروریات اور فطرت کے لیے موزوں ہو۔

دوسرا بڑا مغالطہ یہ خیال ہے کہ جو لوگ رسمی اسکول نہیں گئے وہ غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ کئی ایسے لوگ جو سکول نہیں گئے مگر زندہ رہنے کی جدوجہد کے تجربے نے انہیں اتنا شعور و عقل دی ہے کہ وہ اکثر ان لوگوں کی نسبت زندگی کا اچھی طرح سامنا کرتے ہیں جنہوں نے رسمی تعلیم لی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بچے اکثر اپنی اندرونی حقیقت کو بیرونی دنیا کے ساتھ جوڑنے کے قابل ہوتے ہیں۔

بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی اندرونی حقیقت کی کھوج لگانے کی خواہش محسوس کرتے ہیں، اور بڑے عرصے تک بیرونی دنیا سے لاتعلق ہو کر سوچ بچار، غور و فکر اور دیگر روحانی مشقیں کر کے روحانی طاقت اور علم حاصل کرتے ہیں مگر پھر بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس علم کو کامیابی کے ساتھ بیرونی دنیا کے ساتھ نہ جوڑ سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تعلیم صرف رسمی نظام کے ذریعے حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی صرف دنیا میں رہنے کے تجربات سے یا صرف روحانی مشقوں سے حاصل ہوتی ہے۔ تعلیم ان تمام

عناصر کے ہم آہنگ آمیزے سے حاصل ہوتی ہے۔

اساتذہ عام طور پر اس اعتماد کے ساتھ کمرہ جماعت میں آتے ہیں کہ انہیں مضمون کے بارے میں مکمل علم ہے اور وہ انہیں یہ بھی اچھی طرح پتا ہے کہ کن طریقوں سے یہ علم بچوں کو دینا ہے۔ مگر اساتذہ کمرہ جماعت میں اپنے ساتھ اپنے غیر یقینی حالات، اپنے اور بچوں کی دنیا کے متعلق محدود علم بھی لاتے ہیں۔

تعلیم کے نظریے کے متعلق کئی مکتبہ فکر ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک مکتبہ فکر کا زور علم کے حصول پر ہو، دوسرے کی نظر میں مہارت سازی کی زیادہ اہمیت ہے جبکہ تیسرے کا خیال یہ ہوسکتا ہے کہ جذبات کی نشوونما تعلیم کا سب سے اہم پہلو ہے۔ اور ایک مکتبہ فکر ایسا ہے جو سمجھتا ہے کہ اپنی روحانی ذات کی نشوونما سب سے اہم ہے اور دوسرے کے خیال میں تعلیم سے مراد کسی فرد کی مکمل شخصیت کی نشوونما ہے۔

نظریاتی لحاظ سے یہ تمام تصورات معقول اور بامعنی ہیں، مگر جب کسی استاد کو طالبعلموں سے بھرے کمرہ جماعت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اسے یہ سمجھ نہیں آتی کہ وہ ان مختلف نظریات کا اطلاق کیسے کرے جس کے باعث اس پر گومگو کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اس وقت سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کمرہ جماعت میں موجود ایک خاص گروپ کے طالبعلموں کے لیے تعلیم کا سلسلہ کہاں سے اور کیسے شروع کیا جائے۔

آج اساتذہ کو تعلیم سے متعلق کئی جریدوں اور کتابوں تک رسائی ہے جن میں مختلف عمر کے بچوں کو مختلف مضامین پڑھانے کے لیے تخلیقی سرگرمیوں اور جدید طریقوں کے استعمال بارے تجاویز دی گئی ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کہ اکثر اوقات یہ خیالات کے شاندار ذرائع ہوتے ہیں اور اساتذہ ان سے متاثر ہوکر انہیں کمرہ جماعت میں متعارف کرواتے ہوں گے، اپنے طریق ہائے کار کو اپ ڈیٹ کرتے اور بیزاری اور یکسانی کو ختم کرنے کے لیے انہیں استعمال میں لاتے ہوں گے۔ ایسی کتابیں اور جریدے اہم ہیں مگر استاد کے اندر موجود تخلیقی صلاحیت کی کان کی دریافت کے لیے اور کچھ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ صرف اسی صورت میں استاد اپنی اور اپنے طالبعلم کی شخصیت میں نکھار لاسکتا/سکتی ہے۔

ہمیں تعلم پر لکھی کتابیں پڑھنے سے تعلیم سے متعلق تمام سوالوں کے عملی جواب نہیں مل سکتے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ ہندوستان اور دنیا کے دیگر علاقوں میں فیلڈ میں ہونے والے مختلف قسم کے تجربات کا ہمیں صرف کتابیں پڑھنے سے ہی پتہ چل سکتا ہے۔ ان تحریروں میں کامیابیوں، پریشانیوں اور گومگو کی کیفیت کا ذکر ہوتا ہے جس کا شکار ہم بھی ہوتے ہیں۔

بطور استاد ہمیں بھی ایسی کئی مشکلیں پیش آتی ہیں جو کہ ناقابل حل معلوم ہوتی ہیں یا ایسی مشکلیں جن کے بارے میں ہم سوچنا نہیں چاہتے۔ ہمارے معاشرے میں کچھ مسائل نے بھی جڑیں پکڑی ہوئی ہیں جو بہت بھاری معلوم ہوتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ کسی بھی تعلیمی عمل میں ان کا حل موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ، بچوں کی شخصیت کی نشوونما کے حوالے سے کمرہ جماعت کے مسائل بھی ہیں جن سے بہت احتیاط سے نبٹنے اور صبر اور انسانی ذات پر پختہ یقین کرنے کی ضرورت ہے۔ بطور استاد ہمارے اپنے تجربات پر غور کرنے کی ضرورت ہے اور اگر وہ ماہرین تعلیم پر استعمال ہوسکتے ہیں تو پھر ان تجربات کو شیئر کرنا چاہیے۔ اس

> آج اساتذہ کو تعلیم سے متعلق کئی جریدوں اور کتابوں تک رسائی ہے جن میں مختلف عمر کے بچوں کو مختلف مضامین پڑھانے کے لیے تخلیقی سرگرمیوں اور جدید طریقوں کے استعمال بارے تجاویز دی گئی ہوتی ہیں۔

کتاب میں میں نے یہی کچھ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس سوال کی طرف واپس آتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ یہاں میں نے چند خیالات پیش کیے ہیں جن پر میرا پختہ یقین ہے۔ پہلا، بچے چاہتے ہیں کہ وہ لوگ ان کے ساتھ دیانتدارانہ، گرم جوش، محبت بھرا اور محفوظ تعلق قائم کریں جو ان کے قریب ہیں اور ان کے لیے اہم ہیں۔ بچوں کو ایسے لوگوں سے وابستہ ہونے کی ضرورت ہے جو انہیں اپنی حقیقی شخصیت سازی کرنے کی آزادی دیں۔ انہیں قابل اعتماد لوگ چاہئیں جو ان کا ساتھ دیں، انہیں قبول کریں اور ان کی نشوونما کے عمل میں ان کی رہنمائی کریں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے جب اپنے جذبات کو کنٹرول اور احساسات کا اظہار کررہے ہوتے ہیں تو اس وقت انہیں بالغ افراد سے افہام وتفہیم اور مدد کی ضرورت ہے۔ اس کے نتیجے میں انہیں زندگی میں اپنے لیے اور دوسرے کے لیے صحت مند رویے اور اقدار اپنانے میں مدد ملے گی۔

بچوں کو اپنی اندرونی ذات ڈھونڈنے، دریافت کرنے اور تشکیل دینے کے لیے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ انہیں اپنے ماحول کا کھوج لگانے، اس میں پائے جانے والے مواقع دریافت کرنے اور اس کے ساتھ تخلیقی تعلق استوار کرنے کے لیے زمان و مکان کی ضرورت ہے۔ اس عمل کے دوران وہ معاشرے میں دوسرے لوگوں کو اہمیت دینے اور ان کی عزت کرنا سیکھیں گے۔

ضابطوں کی ضرورت ہے

بچوں کو اپنی سرگرمیاں چننے کی آزادی ہونی چاہیے مگر اس ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے لیے کچھ حدود وطے کی جائیں تاکہ وہ اپنی آزادی ذمہ داری کے ساتھ استعمال کرنا سیکھیں۔ اسکول کی ہر سرگرمی میں حدود ضروری ہیں چاہے کھیل ہو یا پڑھائی ہو رہی ہو، اور ان حدود کو ضابطے کہا جاسکتا ہے۔ یہاں نمونے کے طور پر ان ضابطوں کی کچھ مثالیں دی گئی ہیں جو ہم نے سنٹر میں متعارف کروائے تھے۔

الف۔ مواد کا خیال رکھنا

ڈرائنگ شروع کروانے سے قبل، پہلی جماعت میں ہی میں نے بچوں کو بتایا کہ کریونز ہم سب کے ہیں اور اگر انہوں نے لاپرواہی برتی اور کریونز گم کردیے تو پھر ڈرائنگ نہیں ہوسکے گی۔ اس لیے انہیں بہت احتیاط کرنا پڑی اور انہوں نے استعمال کے بعد واپس رکھ دیے۔ جماعت ختم ہونے کے بعد، بچے خود کریونز گنتے تھے اور پھر انہیں ڈبے میں رکھ دیتے تھے۔

یہ ضابطہ ہر قسم کی حالت میں آٹھ برس تک نافذ رہا، اور بچوں نے سنٹر میں ملنے والے مواد کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سیکھی۔ کسی نے بھی اسکول سے کبھی کوئی چیز چوری نہیں کی تھی چاہے وہ کتنا ہی غریب کیوں نہ تھا یا تھی۔

ب۔ اس بات کا پتہ ہونا چاہیے کہ کب مدد کرنی ہے

بعض بڑے بچے چاہتے تھے کہ وہ ڈرائنگ میں چھوٹے بچوں کی مدد کریں مگر میں انہیں بتاتی تھی، "وہ جو ڈرائنگ بھی کرنا چاہتے ہیں انہیں کرنے دیں اور جو رنگ بھی استعمال کرنا چاہتے ہیں، وہ استعمال کرنے دیں"۔ بڑے بچوں کو اس ضابطے کی سمجھ آگئی کیونکہ انہیں یاد تھا کہ انہیں بھی یہ آزادی دی گئی تھی۔

بعد میں، ڈرائنگ کی ایک جماعت میں گنیشہ نے گروپ کو کہا، " آپ لوگ جو بھی ڈرائنگ کرنا کر سکتے ہیں۔ میں اپنی ڈرائنگ کروں گی"۔ مگر بچوں میں قدرتی طور پر خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کریں، اور میں ان کی اس خواہش کو دبانا نہیں چاہتی تھی۔ آہستہ آہستہ ان کی سمجھ میں آگیا کہ انہوں نے صرف ان کی مدد کرنی ہے جنہیں مدد کی ضرورت ہے اور دوسروں کو خود کام کرنے دینا ہے۔

ج۔ ضابطے ہر کسی کے لیے ہیں

ایک دفعہ دو بڑے بچوں نے دوسرے بچوں کو تیار کیا اور انہیں سنٹر پر لا کر خود ماربل کھیلنے کے لیے چلے گئے۔ میں نے انہیں واپس بلایا اور کہا کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بچے جماعت میں بیٹھیں تو انہیں خود بھی بیٹھنا چاہیے۔ یا پھر دوسروں کو بھی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کریں۔ وہ واپس جماعت میں آگئے۔

میں نے بچوں کا مشاہدہ کرنے کی اپنی صلاحیت بہتر کی اور مختلف قسم کی صورت حال پر نظر رکھتی اور خبر رکھتی تھی۔ اس لیے مجھے ان خاص حالات کا پتہ چل گیا تھا جن میں بچوں کو سادہ مگر مضبوط ضوابط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ضوابط پر بحث ہوتی تھی، ان کی وجوہات کا جائزہ لیا جاتا تھا اور بچوں کو جب اصولوں کی سمجھ آجاتی تھی تو پھر وہ ان پر عمل کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے اس کام کو دہراتے رہنا اور اس پر ثابت قدم رہنا ضروری ہے۔ بچوں نے ضابطوں پر عمل درآمد کی دیانتداری کے ساتھ کوشش کی، اگرچہ انہیں ان پر عمل نہ کرنے فطری خواہش کے خلاف کافی سخت لڑائی لڑنی پڑی۔ یہ بڑی حوصلے کی بات ہے کہ اپنی آزاد فطرت کے باوجود بچوں نے اپنی مرضی سے ان ضوابط کی پابندی کی۔ یہ بات بہت اہم ہے کیونکہ ان بچوں کو اسکول آنے پر آمادہ کرنے کے لیے انہیں کوئی بھی چیز نہیں دی گئی تھی۔

("کھلا کمرہ جماعت: ایک تعلیمی سفر کی روداد" سے اقتباس)

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1 تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ -2 ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقتدار اعلیٰ کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3 ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4 کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جاسکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5 کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6 ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7 قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8 ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، بااختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9 کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10 ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق وفرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11 (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جاسکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12 کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط وکتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13 (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل وحرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آجانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14 (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کارروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جاسکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15 (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16 (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17 (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18 ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتماعی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19 ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20 (1) ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

دفعہ - 21 (1) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22 معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشوونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23 (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب ومعقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب ومعقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جاسکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24 ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25 (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح وبہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26 (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشوونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27 (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں

دفعہ - 28 ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہوسکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29 (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشوونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح وبہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30 اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جاسکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

کراچی: مزدوروں کے عالمی دن کے موقع پر سول سوسائٹی کی تنظیموں نے مزدور عورتوں کے حق میں ریلی نکالی

کوئٹہ: ایچ آر سی پی کے ایک وفد نے جبری گمشدہ افراد کے اہلِ خانہ کے احتجاجی کیمپ جا کر اُن سے یک جہتی کا اظہار کیا

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
''ایوان جمہور'' 107۔ ٹیپو بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
فون : 35838341-35864994 فیکس : 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ : www.hrcp-web.org
پرنٹر : مکتبہ جدید پریس، 14ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15